انشاء
مُدیر
جونؔ ایلیا

ایرانی عوام کی تلخ نوا شاعرہ
سیمین بہبہانی

” یہ میں ہوں سیکڑوں آرزوں اور تمناوں کی ایک لاش جسے سب بھول گئے ۔ میں ایک مسکراہٹ تھی ۔ زندگی کے ہونٹوں کی زندہ جاوید مسکراہٹ ۔ نہ جانے کیا ہوا میں وحشتوں میں گم ہو گئی “

★

★

دربار شاہنشاہی کے ایک ادبی اجتماع م
سیمین بہبہانی ، حسنین کاظمی ، آقائی مش
خانم مشیری

★

★

★
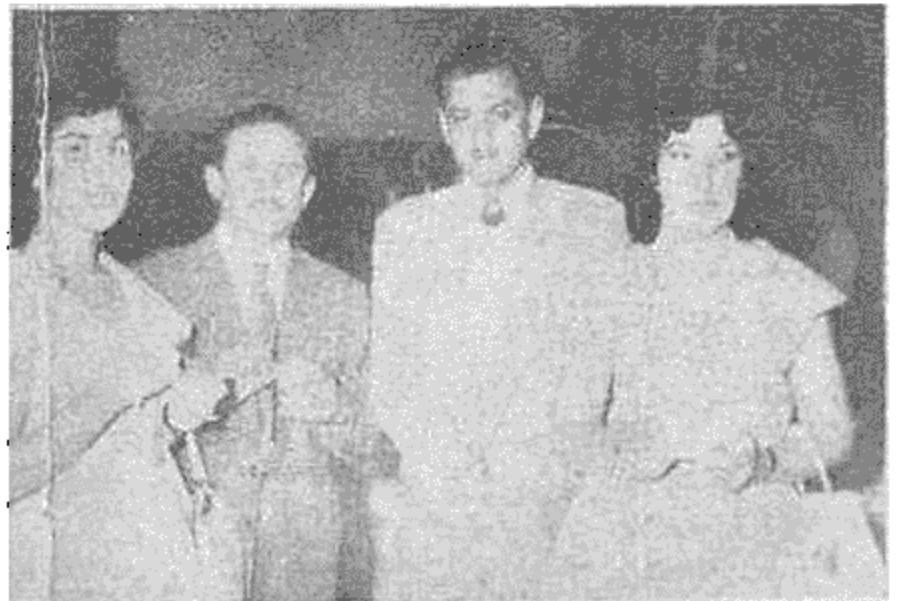
— آئندہ شمارے میں لعبت شیبانی —

انشاء

تاسیس
رئیس امروہوی — سید محمد تقی

مئی سنہ ۱۹۶۰ء

جلد ۴ ۔ شمارہ: ۵

مدیر
جون ایلیا

ادارۂ تحریر
ممتاز سعید — نقی اختر

نظامت
محمد عباس

کتابت: ادارہ فیض الکتابت

ادارۂ ذہنِ جدید
۹۸ ۔ نیو کلاتھ مارکیٹ، بندر روڈ، کراچی

فون: ۳۰۸۹۷ ، ۳۷۴۳۳

قیمت: آٹھ آنے
سالانہ: پانچ روپے

چہرہ نما

جون ایلیا

سفید فام درندے

(انشائیہ)

ہم اُس قوم کا انتظار کرتے رہے جو بچا نہیں سکتی تھی ـــــ اُنہوں نے ہمارے پاؤں اس طرح باندھ رکھے ہیں کہ ہم نکل نہیں سکتے ـــــ ہمارا انجام نزدیک ہے، ہماری مدت پوری ہوگئی، ہمارا وقت آپہونچا۔ ہمیں کچلنے والے آسمان کے عقابوں سے بھی زیادہ تیز ہیں ـــــ (عہدنامہ عتیق، مراثی یرمیاہ)

معلوم ہوتا ہے کہ اُن کا انجام بھی نزدیک ہے اُن کی مدت بھی پوری ہو چکی اور اُن کا وقت بھی آ ہی گیا، وہ زمانہ شاید بہت ہی قریب ہے۔ جب انسانیت کے سینے میں شگاف ڈالنے والے سفید فام وحشی جنوبی افریقہ میں تہذیب کا قتل عام کرنے والے سیاہ کار درندے قوموں کے درمیان اپنی ہلاکت کا نوحہ کریں گے

جنوبی افریقہ میں جو کچھ ہوا ہو رہا ہے۔ اس نے انسان کے تہذیبی وقار کو خاک میں ملا دیا ہے۔ ذرا سوچئے تو سہی کہ بیسویں صدی میں دنیا کے بعض حکمران اور شہزادے یہ فرمان صادر کر رہے ہیں کہ فلاں نسل پست اور حقیر ہے اور فلاں گروہ عظیم اور عزیز۔ معلوم نہیں کہ انہیں غاروں سے باہر نکلنے اور شہروں میں داخل ہونے کی اجازت کس نے دی، اور اب ہم سن رہے ہیں کہ انھوں نے جنوبی افریقہ کے باشندوں سے انسان ہونے کا اعزاز بھی چھین لیا ہے اور گویا وہ جانوروں کو تہذیب سکھانے کا مشہور عالم فرض انجام دے رہے ہیں ہم ضمناً یہ بھی واضح کر دیں کہ قوموں کو تہذیب سکھانے کا یہ احمقانہ خواب کافی پرانا ہو چکا ہے۔ نسلی امتیاز پسندی کا یہ بیہودہ اور جاہلانہ خبط شریف انسانیت کے لئے ناقابل برداشت ہے۔ افسوس کہ نسلی غرور کے اس پاگل پن نے بعض مہذب ترین ملکوں سے تقویت حاصل کی ہے۔ ہم انسانوں کو ایشیائی افریقی اور یورپی خانوں میں تقسیم کرنا جہالت اور حماقت خیال کرتے ہیں۔ لیکن ہم کسی قوم کو ہدف ظلم و شقاوت بنتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے ـــــ آپ نے سنا ہوگا کہ جنوبی افریقہ کے سفید فام حکمرانوں نے وہاں کے اصل باشندوں پر کتنا عجیب و غریب قانون عائد کیا ہے۔ کتنا عجیب ہے یہ قانون کہ ملک کے حقیقی مالک شناخت نامے کے بغیر ایک قدم بھی اپنے گھروں سے باہر نہیں نکال سکتے۔ شناخت نامہ موجود نہ ہونے کی صورت میں پولیس انھیں پکڑ کر جیل میں ڈال دیتی ہے۔ یا پھر جرمانہ وصول کیا جاتا ہے۔ اس طرح ان کا وطن اُن کے لئے "زنجیر خانہ حادثات" ہو کر رہ گیا ہے۔

اس صورت حال کے خلاف وہاں کے حریت پسند عوام نے جو تحریک شروع کی ہے۔ اس کی کامیابی پر دراصل تمام انسانوں کا وقار منحصر ہے۔ انھیں لوٹا جا رہا ہے اُن پر زندگی حرام کر دی گئی ہے۔ لیکن تاریخ کے فیصلے نہیں بدلا کرتے مستقبل اپنی عظیم مشیت

انشائیہ

کو منوا کر رہے گا، ممکن ہے کہ وقتی طور پر آزادی کی روح کو کچل دیا جائے مگر کب تک۔ یہ عہد اقتدار پسند قوموں کی استعمار پسندانہ بربریت اور بدمعاشی کے لئے قطعًا ناسازگار ہے۔ جنوبی افریقہ کے بدمعاش اور جرائم پیشہ حکمرانوں کی اس بدتہذیبی، کمینگی اور درندگی نے دنیا میں نفرت اور غیظ و غضب کی لہر دوڑا دی ہے۔ ہم لندن کے ان شریف اور انسانیت دوست انسانوں کا ذکر کرتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں جنہوں نے نسلی تعصب کے خلاف پر زور احتجاج کیا ہے۔ ہم عالمی اداروں سے سفارش کریں گے کہ وہ اپنی تہذیبی اور سیاسی تنظیموں سے مجرموں کے اس ذلیل گروہ کو باہر نکال دیں۔ یہ غنڈے قطعًا اس قابل نہیں کہ انھیں انسانوں کے برابر بیٹھنے کی اجازت دی جائے۔ جنوبی افریقہ کے عوام کا مطالبہ اب صرف یہی نہیں کہ غاصب حکومت اپنے ذلیل قانون میں ترمیم کرے۔ اب تو مکمل آزادی کا سوال ہے حق کا مطالبہ ہے۔ جمہوریت پسند قوموں کا فرض ہے کہ وہ انھیں ان کا حق دلائیں۔

جنوبی افریقہ کی یہ ذلیل حکومت دولت مشترکہ کی رکن ہے۔ ہم دنیا کے تمام انسانیت دوست دانشوروں، ادیبوں اور جمہوریت پسند عوام کی طرف سے دولت مشترکہ سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اس کی رکنیت منسوخ قرار دیدے۔ اقوام عالم کو کم از کم ایک قدر پر تو متفق ہونا ہی چاہئے۔ اور وہ قدر "انسانیت" ہے ہمیں ملال ہے کہ ہم نے ایک انسانی گروہ کے لئے یہ سخت لہجہ اختیار کیا مگر وہ انسان ہی کب ہیں؟ اُن کی وحشیانہ حرکات جامعہ انسانیت کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہیں یہاں ہمیں ان مسکین اور مظلوم قوموں سے بھی کچھ کہنا ہے جنہیں یہ تہمتیں اور گالیاں سُننا اور سہنا پڑتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ گالی نسل اور رنگ کو نہیں دیجاتی، صورت حال کی اتنی براہ راست اور سادہ توجیہہ کرنا صحیح نہیں یہ گالی تو دراصل علمی پسماندگی تہذیبی محکومیت اور سیاسی ماموریت کو دیجاتی ہے، جب یہ ہوتا ہے تو پھر یہی ہوا کرتا ہے۔ مختلف سماجوں اور ثقافتوں کے درمیان توازن کا ناپید ہو جانا تاریخ کا سب سے بڑا فتنہ ہے۔ پھر ہوتا یہ ہے کہ قدروں کو توڑنے والے ہی قدروں کے آفریدگار کہلاتے ہیں، کیا کوئی سفید فام قوم ان غیر مغربی اقوام کو نسل کا یہ طعنہ دینے کی جرأت کر سکتی ہے جو سائنسی اور سیاسی طور پر ہمت شکن قوتوں کی مالک ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے؟

نیا سلسلہ:-

آئندہ اشاعت سے ہم مضامین کا ایک اہم سلسلہ شروع کر رہے ہیں اس کے لئے جناب تنزیل الرحمٰن کی خدمات حاصل کی گئی ہیں یہ سلسلہ دنیا کی عدالتوں میں پیش ہونے والے مشہور ترین مقدمات سے متعلق ہوگا ہم سمجھتے ہیں کہ اس طرح انسانی فطرت کے بعض عجیب و غریب پہلو اور نفسیات انسانی کے بعض انتہائی اہم گوشے قارئین کے سامنے آئیں گے۔ امید ہے کہ اس کے بعد اخلاقی قدروں سے متعلق کچھ نتیجہ خیز بحثیں چھیڑی جا سکیں گی۔

سرورق

اس بار سرورق پر ایران کے ممتاز چہرہ نگار شیرمنش کا ایک نمائندہ فن پارہ پیش کیا جا رہا ہے

ریحانہ جمال

یہ کیا ہو گیا!
مگر علم، ذہانت، عشق اور حسن کی بہترین سزا یہی ہے۔

——— کہ ناگہاں کسی نے یہ دیکھا کہ دنیا کی ستائی ہوئی ایک خانماں برباد روح گرجا میں داخل ہو رہی ہے ——— زمانہ۔ حسن، وقار اور تمکنت کے مجسموں کو اس طرح برباد کرتا ہوا گزر جاتا ہے کہ جاننے والے بھی انھیں نہیں پہچانتے ———

دوشیزگان فرانس کا محبوب ترین نوجوان

حسین اور شعلہ بیان خطیب

بیباک اور نڈر فلسفی

مقدس و محترم عالم دین

ایشیا اور یورپ کے پڑھے لکھے حلقوں میں وہ کون ہے جو اُسے نہ جانتا ہو۔ قرون وسطی کی علمی خانقاہوں میں اس کا باوقار سایہ آج بھی سب سے علیحدہ اور جداگانہ نظر آتا ہے۔ میری مراد پطرس ابیلارڈ سے ہے جس کی داستانِ محبت فلسفیوں کے گروہ میں ایک ناقابل فراموش حیثیت رکھتی ہے۔ اسلئے کہ اس کا تعلق ابیلارڈ جیسے فلسفی سے ہے ——— وہ فلسفی جس کی جرأت، بے باکی اور آزاد خیالی کا اعتراف خود ہیوگو کو بھی تھا۔ کون ہیوگو؟ سینٹ وکٹر کی خانقاہ کا باقتدار اور تیز کلام راہب اور ابیلارڈ کا سخت ترین حریف اس کے علاوہ برنارڈ ولیم۔ گلبرٹ اور جان سلسبری۔

ان میں سے کسی کو بھی اس حقیقت سے انکار نہیں ہو سکتا کہ قرون وسطی کے فلسفیوں میں ابیلارڈ سے زیادہ روشن خیال اور پرجوش فلسفی کوئی دوسرا نہ تھا۔

داستان عشق

مگر اس سے پہلے ہمیں ابیلارڈ کے بارے میں کچھ اور بھی جاننا چاہئے وہ ۱۰۷۹ء میں ——— نانتیز ——— کے قریب "پیلس" نامی ایک بستی میں پیدا ہوا اور فرانس کے مشہور عالم اور تیز زبان مناظر ولیم شامپو سے علمی اور مذہبی تعلیم حاصل کی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بچپن ہی سے بلا کا شوخ کلام واقع ہوا تھا۔ ہمیں اس کی ایک

صنف کو خاص طور پر ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ یہی تیز زبانی اور شوخ کلامی تھی جس نے اس کی زندگی کو شدید ترین حالات سے دوچار کر دیا۔ وہ کس درجہ غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک تھا، اس بات کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے۔ کہ خود اس کا استاد ولیم شامپو اس سے جلنے لگا اور مخالفت پر اُتر آیا۔ ۲۲ سال کی عمر میں اس نے میلن اور پھر کوربیل میں ایک مدرسے کی بنیاد رکھی[1]۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ہم کلیسا کے اس مقدس و محترم فلسفی سحر طراز خطیب اور معزز ترین عالم دین کو عقیدتمندوں کے ایک عظیم مجمع میں تقریر کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ وہ اپنے پرزور انداز بیان میں کھویا ہوا ہے۔ مجمع اس کے ساحرانہ انداز سے مبہوت ہے۔ حاضرین میں فرانس کی حسین اور تخیل پسند لڑکیاں بھی موجود ہیں۔ جن کے ذہنوں پر اس نوجوان مقرر اور فلسفی کی مرعوب کن شخصیت پوری طرح مسلط ہو چکی ہے۔ اتفاق سے تقریر کا موضوع بھی بہت ہی برمحل ہے یعنی :

صنف نازک

اجتماع میں پیرس کے معزز ترین اور امیر کبیر گھرانے کی ایک حسین باوقار سنجیدہ اور سراپا تمکنت دوشیزہ بھی بیٹھی ہے۔ مغربی فلسفے کی تاریخ کے قارئین اس باحوصلہ اور حساس دوشیزہ سے خوب واقف ہیں۔ یہی تو اس زندہ جاوید داستان کی رُوح ہے۔

اس کا نام ہیلیس[2] ہے۔ وہ ابیلارڈ کی تقریر کے ایک ایک لفظ کو انتہائی غور سے سن رہی ہے اور اس ہجوم میں بالکل تنہا نظر آتی ہے اسے اپنے گرد و پیش کی کوئی خبر نہیں۔ تقریر ختم ہو گئی مگر اسے معلوم ہی نہ ہوا لوگوں کے دل عقیدت و نیاز اور داد و تحسین کے جذبات سے معمور ہیں۔ ہر شخص کی یہ خواہش ہے کہ وہ ابیلارڈ کے دامن کو بوسہ دے اور ہاتھوں کو چومے، آخر وہ بھی اُٹھی اور ہجوم کے درمیان سے گزرتی ہوئی ابیلارڈ کے سامنے پہونچ گئی اور جھجکتی ہوئی اسکے قریب آئی یہ

دوشیزہ کا محبوب

اب یہ افسانہ شروع ہو چکا ہے۔

ہیلیس گھر واپس آئی مگر اس کی روح ابیلارڈ کی پرکشش باوقار اور عظیم شخصیت میں فنا ہو چکی تھی۔ کتنے عظیم ہیں پطرس ابیلارڈ۔ ان کے خیالات اُن کا لہجہ ان کی آواز اور ——— اور وہ خود ——— وہ اس نوجوان عالم دین کی شخصیت کے ہر پہلو پر مستقل سوچے جا رہی تھی۔

اُن کے لمحات کتنے قیمتی اور کتنے مصروف ہیں!

وہ فلسفہ کی تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی اس لئے کہ اس کا محبوب فلسفی تھا۔ اس کی انتہائی آرزو تھی کہ ابیلارڈ ہی اسے فلسفے کی تعلیم دے مگر بظاہر یہ بات ممکن نہ تھی۔ فرانس کا مایۂ ناز نوجوان معروف فلسفی اور مقدس عالم ایک دوشیزہ کی یہ خواہش کیسے پوری کر سکتا تھا۔ اس کی شہرت و عظمت نقطۂ کمال پر پہونچ چکی تھی۔ فرانس کے علمی و ادبی نوجوان اس کے افکار و خیالات پر گھنٹوں گفتگو کرتے تھے۔ قرن وسطیٰ کی خانقاہوں میں اس کے اقوال ثبوت اور حوالے کے طور پر پیش کئے جاتے تھے۔

مگر پیرس کے منتخب و ممتاز خاندان کی نازپروردہ دوشیزہ۔ اور فرانس کے بااثر پادری فلبرٹ کی بھتیجی ہیلیس کی یہ آرزو اب شدت اختیار کر چکی تھی کہ وہ فلسفہ کی تعلیم حاصل کرے اور خود ابیلارڈ اسے تعلیم دے۔ یہاں سے ابیلارڈ اور ہیلیس کی تاریخی خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور محبت کی بے زبانی نے قرطاس و قلم کو بولنا سکھا دیا۔ اب ان دونوں کے مکتوبات محبت پیش کئے جاتے ہیں۔ یہ خطوط ۱۶۱۶ء میں فرانسیسی۔ جرمن۔ انگریزی۔ اسپینی اور دنیا کی دوسری زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ انھیں ایک ادبی سرمایہ کی حیثیت حاصل ہے۔ ابیلارڈ کے خطوط پر تقدس۔ وقار اور عظمت کا رنگ غالب ہے معلوم ہوتا ہے کہ ایک روحانی مرشد اپنی عقیدتمند مگر محبوب ترین راہبہ کی ناز برداری کر رہا ہے دوسری طرف ہیلیس کے خطوط میں اس کی

---

[1] تاریخ فلسفہ (ویب) [2] Heloise

بےتاب دوشیزگی، پُرارمان سادگی اور جذبات انگیز نیازمندی کی روح دوڑی ہوئی ہے، آخر تو ابیلارڈ اس کے دل کا دیوتا ہے۔ وہ اُسے کتنا چاہتی ہے! کتنی پرستش کرتی ہے! —اس خط و کتابت کو ریحانہ جمال نے مرتب کیا ہے۔ (جون ایلیا)

دوشیزہ ہیلس کا خط پطرس ابیلارڈ کے نام

تقدس مآب محترم پطرس ابیلارڈ!

آپ میری اس جرأت و جسارت کو معاف فرماویں کہ میں آپ کو اس بے تکلفی سے مخاطب کر رہی ہوں۔ شاید آپ کو یاد ہوگا کہ جب آپ "لی اَوَنس" — میں "صنف نازک" کے موضوع پر تقریر فرما رہے تھے تو آپکی عظیم اور با اخلاق شخصیت کے زیر سایہ ایک عقیدتمند لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ آپکی تقریر کا ہر لفظ حکمت و معرفت علم و فضل اور بے مثال تبحر میں ڈوبا ہوا تھا۔

علامۂ محترم! آپ کتنے بلند نظر اور روشن خیال ہیں! تقریر ختم ہونے کے بعد حاضرین نے آپکی خدمت عالی میں تحسین و آفرین کے ہدیئے پیش کئے تھے، اسی موقع پر آپ سے میرا تعارف کرایا گیا۔ آفتاب سے ایک ذرۂ ناچیز کا تعارف۔ آپکی مرحمت آگیں مسکراہٹ اور آپکے متبرک و مبارک ہاتھوں کا گرم اور پرجوش لمس مجھے اس وقت بھی یاد ہے۔ مگر مجھے یقین نہیں کہ میں بھی آپ کو یاد رہی ہونگی—

میرے عالی مرتبت رہنما! مجھے فلسفے سے بیحد دلچسپی ہے۔ آپ اس بات پر یقین تو نہیں فرما سکیں گے کہ ایک ناتجربہ کار لڑکی علم و حکمت کی دقیق بحثوں سے دلچسپی لے سکتی ہے لیکن یہ ایک حقیقت ہے۔ میں آپ کی بلند پایہ اور جلیل المرتبت شخصیت میں گم ہو گئی ہوں —

اے میرے استاد محترم کیا آپ اپنے علم و فضل کے دریائے بیکراں سے چند بوندیں مجھ ناچیز کو مرحمت نہ فرمائیں گے؟

آپ کی عقیدتمند طالبہ

ہیلس

ابیلارڈ کا جواب

مارسلیز!

کتب خانہ ابیلارڈ

عزیزہ ہیلس! مجھے آپ کا عنایت نامہ مل گیا تھا مگر بعض اہم مصروفیات کی بنا پر فوراً جواب نہ دے سکا۔ میں اس تاخیر کے لئے آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ عزیزہ گرامی! اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ آپ مجھے اپنے آپکو یاد دلائیں۔ دراں حالیکہ خدا نے آپ کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ اس کے بندے آپ کو یاد رکھیں۔ میں دیر تک آپ کے عنایت نامے کو دیکھتا رہا اور اس صحبت کو یاد کرتا رہا جہاں مجھ سے آپکا تعارف کرایا گیا تھا۔

یوں تو ہم سب کی زندگی آنی اور فانی ہے لیکن اس زندگی میں بعض لمحے ابدی اور جاودانی ہوتے ہیں۔ زندگی کے ایسے ہی لمحوں کو سرمایۂ حیات کہا جا سکتا ہے۔ تعارف کے وہ لمحے یقیناً ابدی اور جاودانی تھے۔

اے پاک و پاکیزہ ہستی! آپ نے میری نسبت جن پاکیزہ خیالات کا اظہار کیا ہے وہ آپ کی شرافت اور نیک دلی کی علامت ہیں۔ مجھے یہ جان کر انتہائی مسرت ہوئی کہ آپ فلسفے سے دلچسپی رکھتی ہیں۔

بقراط اپنے شاگردوں سے اکثر کہا کرتا تھا کہ سوچو! اور برابر سوچتے رہو! — عزیزِ گرامی! کیا میں بھی آپکی خدمت میں یہی مشورہ پیش کرنے کی عزت حاصل کرسکتا ہوں؟ بتائیے کہ اس سلسلے میں خاکسار آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہے؟ میں آپکی خدمت کو اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔ مجھے آپکے جواب کا انتظار رہے گا۔

آپکے حسن اخلاق کا گرویدہ

ابیلارڈ

دوشیزہ ہیلس کا خط:

پیرس

عزیز و عظیم فلسفی! ——— مجھے امید نہیں تھی کہ اتنی جلد جواب حاصل کرنے کی عزت حاصل کرسکیں گی۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ آپ کسقدر معروف رہتے ہیں۔ پھر مجھے یہ بھی خوف تھا کہ شاید آپ میرے عریضے کا جواب ہی نہ دیں۔

میں کیا بتاؤں کہ آپکی عظمت مآب اور دلکش شخصیت نے مجھے کسقدر متاثر کیا ہے! میں ہر وقت آپ ہی کی ذات گرامی اور آپ ہی سے تعلق رکھنے والے مسائل کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں۔ میں اس کے علاوہ اور کچھ سوچ ہی نہیں سکتی۔ جب بھی آپ کی باعظمت فضلیت مآب اور نورانی زندگی پر نظر ڈالتی ہوں تو حیران رہ جاتی ہوں۔ آپ کی روحانی دلکشی اور باطنی کشش نے مجھے مسحور کرلیا ہے۔ اور میں بےبس ہوگئی ہوں۔ اب تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ سے متعارف ہونے سے پہلے میری روح میں گتھیاں پڑی ہوئی تھیں اور اب وہ گتھیاں سلجھ گئی ہیں۔ اے وہ محترم ذات کہ جس کی نگاہوں کے سامنے تمام کائنات ایک سادہ ورق کی طرح کھلی ہوئی ہے! آپ اس کا سبب بتا سکتے ہیں؟ کیا آپ وضاحت فرماسکتے ہیں کہ اس عقیدت اور ارادت کی وجہ کیا ہے؟ کیا سبب ہے کہ آپکے باطنی فضائل و کمالات کا تصور ایک نورانی اور زرین ہالے کی طرح ہر لمحہ مجھے گھیرے رہتا ہے۔؟ شاید آپ میرے سوالات کو سمجھ گئے ہونگے اب میں اپنا نیاز نامہ ختم کرتی ہوں۔ وہ مقدس و محترم مصروفیات جن سے سینکڑوں تشنگان علم و حکمت کی اُمیدیں وابستہ ہیں صرف میرے لئے نہیں ہیں۔ میں کچھ اور بھی لکھنا چاہتی تھی مگر ....

آپکی ناچیز عقیدت مند

ہیلس

ہیلس کا یہ خط بہت ہی معنی خیز ہے لفظ لفظ میں اس کا ادبی اضطراب پوشیدہ ہے اور جوشِ اظہار کا ایک طوفان ہے جو تکلف و تامل کے ہر بند کو توڑ دینا چاہتا ہے لیکن ابیلارڈ کی واجب الاحترام شخصیت کا رعب و جلال اور آدابِ عقیدت و نیاز کا لحاظ مانع ہے۔ اور پھر شرم و حیا اس بات کو ظاہر کرنے سے روکتی ہے جس کا چھپانا روح کے لئے عذاب ناک ہو جاتا ہے۔ معصوم اور مجبور ہیلس ایک عجیب کرب میں مبتلا ہے مگر کون جانے کہ یہ کرب کتنا لذیذ ہوتا ہے! ابیلارڈ نے یہ خط پڑھا۔ ابتک اس معصوم اور نوجوان فلسفی سے صرف علمی فلسفیانہ اور دینی مسائل سے متعلق سوالات کئے گئے تھے یہ اس کی زندگی میں پہلا موقع تھا جب ایک بیتاب و مضطرب مگر انتہائی باادب اور مہذب دوشیزہ اپنی تحریروں میں اپنی دوشیزہ روح کے جذبات لیکر آئی تھی۔

ابیلارڈ نے اس خط کا جواب لکھا، ظاہر ہے کہ وہ عظمت و تقدس کی فضا میں رہنے والا ایک نوجوان تھا — ایک فلسفی نوجوان جس پر خود اپنی شخصیت کا احترام بھی واجب تھا اور خود اپنے اور ایک حسین دوشیزہ کے جذبات کی رعایت بھی فرض تھی۔ آخر اس نے احتیاط اور شوق کی ملی جلی کیفیات کے

ساتھ ایک بلیغ مکتوب لکھا۔

ابیلارڈ کا جواب

مارسیلز

نیکدل ہیلس! آپ کا مکتوب عزیز ملا۔ اور مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہئے کہ عین انتظار کے عالم میں ملا۔
آپ نے میری زندگی اور مصروفیات کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس حد تک تو یقیناً صحیح ہے کہ میں ایک معروف زندگی بسر کرتا ہوں، لیکن میرے بارے میں یہ طے کر لینا یقیناً ایک ظلم ہے کہ میں ان مصروفیات میں آپ کو یاد نہ رکھ سکا۔

عزیزۂ گرامی! ایک یونانی شاعر نے لکھا ہے کہ

"چشمہ کسی میدان میں بھی کیوں نہ پھوٹے سمندر کی طرف ہی بہتا ہے۔"

"اور دل کسی عالم میں بھی کیوں نہ ہو آخر دوست کی طرف رجوع کرتا ہے۔"

لہٰذا اے مہربان ہستی! میں یہ کیونکر بھول سکتا ہوں کہ ایک ذہین اور علم دوست شخصیت میرے ناچیز مشاغل کو دلچسپی اور قدر کی نظر سے دیکھ رہی ہے۔

ہیلس! ہم زندگی میں بہت کچھ بھلا دیتے ہیں اور بہت کم چیزیں یاد رکھتے ہیں ان بہت کم چیزوں میں سے تم بھی ہو —— آپ بھی ہیں —— میں یہ کہنا چاہتا ہوں —— مجھے اندیشہ ہے کہ میرا یہ بے تکلفانہ انداز شاید آپ کو گراں گزرے۔ مگر اے عزیزہ! بلکہ اے سب کچھ! غریب ابیلارڈ مجبور ہے کہ وہ اپنے خیالات واضح کرنے کے لئے کوئی انداز بیان اختیار کرے۔

ہر انسان کی روح غلاف میں لپٹی ہوئی ہوتی ہے مگر جب کوئی نرم اور مہربان ہاتھ اس غلاف سے مس ہوتا ہے تو پھر یہ غلاف کتان کے نازک ترین پردوں کی طرح تارتار ہو جاتا ہے اور انسانی روح اس غلاف سے اس طرح باہر نکل آتی ہے جیسے سربند پتیوں کو گلاب کا تروتازہ پھول ...... میری روح پر سے بھی یہ غلاف اتر گیا ہے اور اب وہ آپ کی نگاہوں کے سامنے اپنی اصل حالت میں موجود ہے .... شاید آپ کی روح بھی!

میں آپ کو خط لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ چند سطریں لکھنے میں کئی دن صرف ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ میں اپنی حاضر دماغی اور زود نویسی کے لئے مشہور ہوں۔ نہیں معلوم کہ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ مگر ہوتا ہے — اکثر تو ایسا ہوتا ہے کہ میں پورا خط لکھ کر چاک کر دیتا ہوں۔ کہیں وہ آپ کی شان کے شایاں نہ ہو...... میری روح میں آپ کے لئے غیر معمولی عقیدت و احترام کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ آسمان سے آپ کو ظاہری و باطنی دونوں طرح کا حسن ملا ہے۔ جس طرح چاندنی کی روشنی اور شگفتی نباتات کی پرورش کا سبب ہے یا گلاب کی تازگی جو روح کو فرحت اور دماغ کو طاقت بخشتی ہے بس اے عزیزہ روح! .....

اب مجھ سے کچھ نہیں لکھا جاتا —— مجھے چند روز کے لئے منز۔ پیرپاز۔ مری۔ لی آونس اور پھر —— منز جانا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ جب تک میں مارسیلز واپس نہ آ جاؤں اس وقت تک آپ جواب نہ لکھیں۔ میں آپ کے خط کو ہر جگہ ڈھونڈ لوں گا۔ بشرطیکہ آپ جواب دینے کی کوشش فرمائیں۔

آپکا خلوص پیشہ
ابیلارڈ پیٹر

ابیلارڈ - ہیلیس سے پوری طرح متاثر ہو چکا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اسے یہ خیال بھی ہے کہ میں ایک فلسفی ایک دینی عالم اور علمی محقق ہوں -

دوشیزہ ہیلیس کا خط

عزیز ترین جناب "بطرس ابیلارڈ"

آج میری ایک لائق اور ذہین سہیلی نے میری خواہش پر ایک نظم کہی ہے جو خاص طور پر آپ کے ملاحظے کے لئے ارسال خدمت کر رہی ہوں۔ وہ نظم یہ ہے -

"میں دریائے سین میں ایک طوفان برپا دیکھ رہی ہوں یقیناً فطرت بغاوت پر آمادہ ہے"

"چھوٹی چھوٹی کشتیاں کناروں کی طرف بھاگ رہی ہیں اور ملاح اپنے اپنے چپو پھینک کر پناہ ڈھونڈھ رہے ہیں"

یقیناً یہ طوفان بہت ہی شدید اور خوفناک ہے -

مگر میرے دل میں جو طوفان برپا ہے -

وہ اس سے کہیں زیادہ گہرا اور ڈبو دینے والا ہے -

اے دوست!

اس طوفان سے پناہ مل سکتی ہے - مگر اُس طوفان سے بچنا دشوار ہے -

اے دریائے سین!

ذرا ٹھہر جا کہ میں بھی اپنے طوفان کو عریاں کر دوں"

اُمید ہے کہ آپ کا ہیمز - بریاز - ممری - لی اولس اور رمنز کا دورہ پوری طرح کامیاب رہا ہوگا -

آپ کی طالبہ ــــ ہیلیس

ابیلارڈ کا جواب

جان سے زیادہ عزیز! ــــــــ تمہارا دلکش و دلنواز مکتوب نظر افروز ہوا - جس میں تم نے اپنی کسی سہیلی کی ایک عجیب نظم نقل کی ہے - ایک بات پوچھ سکتا ہوں؟

کیا واقعی یہ نظم خود تمہاری نہیں ہے - جس کو تم نے دوسرے سے منسوب کر کے میرے سامنے پیش کیا ہے - آئندہ اگر تم کو میرے خطوط میں بے تکلفی نظر آئے تو خدارا اسے گستاخی پر محمول نہ کرنا - بلکہ میری فطری سادگی اور ہمارے روحانی تعلق کی علامت سمجھنا - آہ ان جذبات کی گہرائی اور ان تاثرات کی شدت کا اندازہ کون لگا سکتا ہے - جو دل کی خلوتوں سے زبان تک آتے آتے پژمردہ ہو جائیں - اور ان نوجوان آرزوؤں کی پہنائی اور وسعت کو بھلا کون سمجھ سکتا ہے جنہیں بیان نہیں کیا جا سکتا -

میں ابھی چند روز ہیمز ہی میں رہوں گا - کیا بتاؤں یہاں چند مشاغل نے میرے پیروں میں زنجیریں ڈال رکھی ہیں - لیکن میں پیرس آنا چاہتا ہوں - جی چاہتا ہے کہ میں پیرس ہی میں رہوں ــ اور اے جمیل ہیلیس تمہاری روح پرور صحبتوں سے "فیضِ معنوی" حاصل کروں ــ رات میں بہت دیر تک قربان گاہ پر تمہارے لئے دعا کرتا رہا - اس خط کے ساتھ ہی تمہارے مطالعے کے لئے اپنی چند کتابیں روانہ کر رہا ہوں - اُمید ہے کہ تم اس موضوع پر مجھ سے تبادلۂ خیالات کرنا پسند کرو گی اور اپنی رائے دو گی -

ابیلارڈ

دوشیزہ ہیلس کا خط

پیرس — ایم فلبرٹ پیلس

ابیلارڈ! ———— آخراور کن لفظوں سے آپ کو مخاطب کروں ؟ — میرے سب سے زیادہ عزیز ابیلارڈ !۔
آپ کا خط ملا۔ اور میں نے یہ محسوس کیا کہ جیسے آپ خود اپنی تمام جاذبیتوں اور عظمتوں کے ساتھ میرے سامنے موجود ہیں۔ خدا کے لئے آپ مجھے غلط نہ سمجھیں۔ مگر میں مجبور ہوں۔ اس دل سے مجبور ہوں۔ جو ابھی تک بے داغ اور شفاف رہا ہے۔ انسانی کمزوریوں کے اعتراف کے باوجود — اے ملکوتی ہستی ! میں فخر کے ساتھ یہ دعویٰ بھی کر سکتی ہوں کہ آج تک کسی نامحرم نظر نے میری روح کو نہیں چھوا اور اب تک کسی اجنبی شخصیت نے میرے دل میں رسائی حاصل نہیں کی — مگر صرف آپ نے — تم نے — کیا تم مجھ کو اس بے اختیار جذبہ پر ملامت کروگے جس نے مجھے اس قدر گستاخ اور بے ادب بنادیا ہے — نہیں ابیلارڈ مجھے یقین نہیں آتا کہ تم اس قدر ظالم ہوگے ...... تم مجھے خدا کے لئے آبرو باختہ نہ سمجھ لینا۔

تمہاری کتابوں کو میں نے بار بار چوما ہے۔ تمہارے عزیز ترین خطوط کو بار بار بوسے دیئے ہیں۔ اے میری روح کے مالک ! .... آہ میں ایک شدید عذاب میں مبتلا ہوں۔ میں کیا بتاؤں کہ میری مصیبت کس قدر شدید ہے۔ جس کی زبان سی دی جائے اور روح میں برچھیاں گھونپی جائیں — اس کی مصیبت کا اندازہ کون کر سکتا ہے ؟ میں نے اپنے چچا سے ضد کی کہ وہ میرے لئے فلسفہ کی تعلیم کا بندوبست کردیں انھوں نے مجھ سے وعدہ کر لیا ہے۔ انھیں کسی لائق اور فاضل معلم کی ضرورت تھی۔ تو میں نے یہ مشکل آسان کردی اور غائبانہ طور پر تمہارا تعارف کرایا۔ تمہاری گراں قدر تصنیفات بھی انھیں دکھائیں۔ اور مجھے فخر ہے کہ انھوں نے تمہاری غیر معمولی لیاقت اور بے مثال ذہانت کی جی کھول کر داد دی۔ اس خط کے ساتھ ان کا بھی ایک خط منسلک ہے۔

تم خواہ کہیں بھی ہو اور کوئی بھی مصروفیت ہو، بہر صورت پہلی فرصت میں پیرس چلے آؤ۔ ایک نیم کشتہ روح اور ایک مضطرب دل۔ شب و روز تمہارے انتظار میں ہے ———— ہیلس

ابیلارڈ کا جواب

لی آونس

میری روح ! ———— میں پریاز اور چبری ہوتا — ہوا لی آونس پہنچا تھا کہ تمہارا خط ملا۔
آہ یہ وہی مقام ہے جہاں میں نے سب سے پہلی مرتبہ تم کو دیکھا تھا اور تمہارے ملکوتی حسن و جمال کے حضور اپنے دل کا حقیر تحفہ بطور نذر پیش کیا تھا۔

تمہیں یاد ہوگا کہ پہلی مرتبہ اس اجتماع میں جو تمہارے وجود کے سبب مجھے دنیا بھر سے زیادہ عزیز تھا۔ میں نے صنف نازک کے موضوع پر تقریر کی تھی مگر آج میری تقریر کا موضوع تھا — محبت —

اے حورارضی !

میں آرہا ہوں ———— پیرس آرہا ہوں۔ جناب ایم فلبرٹ کے لئے جداگانہ خط لکھ رہا ہوں۔ ہیلس تم پر خدا کی رحمت —
اے میری روح کی ملکہ ! ———— اے میری حور ! — اے ہیلس ! تم پر آسمان کی رحمتیں ———— تمہارا اور صرف تمہارا
ابیلارڈ

یہ تھی ان دونوں کی یادگار خط و کتابت ـــ اس سلسلہ کے بعض خطوط اور بھی تھے جو اس میں شامل نہیں اور افسوس کہ ہم بھی انھیں حاصل کرنے میں ابھی تک کامیاب نہیں ہو سکے۔ بہر حال اس داستان کو مکمل کرنے کے لئے مزید واقعات ہم بیان کرتے ہیں۔

ہیلس ابیلارڈ کے عشق میں فنا ہو چکی تھی اور اب اس کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ وہ اپنی پر ارمان اور مضطرب دوشیزگی کو اپنے باوقار محبوب کی نذر کر دے۔ لیکن نوجوان ابیلارڈ کی باعظمت اور مقدس شخصیت کا رعب اظہار جذبات کی راہ میں مانع تھا۔ محبت میں وہ کیفیت بھی بہت ہی خیال انگیز اور لذت آفریں ہوتی ہے جب محبوب یا محبوبہ کی شخصیت کو تقدس اور عظمت کے نورانی ہالے گھیرے ہوئے ہوں اور ناآسودہ آرزوئیں خلوت میں بھی بے نقاب نہ ہو سکیں۔ لیکن یہ پرخلش جھجک اور نشہ انگیز خاموشی کبھی کبھی جذبات میں ہیجان برپا کر دیتی ہے اور یہی ہوا۔

اک سیلاب تھا جو ہیلس اور ابیلارڈ دونوں کو اپنی رو میں بہالے جانا چاہتا تھا اک آگ تھی جو دونوں طرف بھڑک رہی تھی آخر ایک دن نوجوان جذبات کے فشار نے ان دونوں روحوں کو ـــ جسموں کو ـــ ایک دوسرے میں پیوست کر دیا۔

اب وہ محبوب اور محبوبہ ہی نہیں ایک دوسرے کے شریک زندگی بھی تھے۔

اس حسین رشتہ نے ایک خوبصورت بچہ کو جنم دیا۔

نجانے کیوں ان دونوں نے اس رشتے کو ابھی تک راز میں رکھا تھا۔ مگر راز ہمیشہ فاش ہو جایا کرتے ہیں۔ ہیلس کے تندمزاج چچا۔ پادری فلبرٹ نے سنا تو غصہ سے پاگل ہو گیا اور سخت بے رحمی پر اتر آیا۔ وہ ساعتیں بڑی دردناک تھیں جب نوجوان ماں سے اس کے معصوم اور نازنین بچہ کو چھینا جا رہا تھا۔ وہ چیخ رہی تھی کہ میرے بچہ کو چھوڑ دو۔ مگر فلبرٹ نے بے حسی اختیار کر لی تھی۔ اس بچہ کو دور افتادہ علاقے میں بھیج دیا گیا۔ اب ابیلارڈ سے انتقام لینا باقی تھا۔ لیکن اس کے خلاف براہ راست کوئی قدم اٹھانا ممکن نہ تھا لہٰذا اس شریف اور قابل تعظیم انسان کے مکان میں ڈاکہ ڈلوایا گیا۔ اور "مجاہدان کلیسا" کی اس نقب زنی نے علم کے حجرے میں ایک کوڑی بھی باقی نہ چھوڑی۔ اس پر بھی چین نہ آیا تو بدمعاشوں اور غنڈوں سے اس مقدس عالم و فلسفی کی سربازار بے حرمتی کرائی گئی۔ ابیلارڈ جس کے قدموں پر فرانس کے عوام و خواص عقیدت سے سر جھکاتے تھے اس صدمہ کو کسی طرح برداشت نہ کر سکتا تھا۔ اس واقعہ نے اس کو دنیا سے دل برداشتہ کر دیا۔ آخر اس نے ـــ سینٹ ڈینس ـــ کے گرجا میں گوشہ نشینی اختیار کر لی اور ہیلس بھی ـــ ارجنٹل ـــ میں راہبہ ہو گئی۔ دو روحوں کی ایک ہستی دو تنہائیوں میں بانٹ دی گئی تھی / محبت تو خود ہی انسانوں سے بیزار ہے وہ انسانی بستیوں سے بہت دور کسی نادیدہ افق میں پرفشاں رہتی ہے اور صدیوں میں جب کبھی ان بستیوں کی طرف آتی ہے تو اس کے سینہ کو نفرت و عداوت کے تیروں سے زخمی کر دیا جاتا ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے تڑپتے تھے مگر مل نہ سکتے تھے۔

وقت گزرتا رہا ـــ گوشہ نشینی کے دوران ابیلارڈ نے "تثلیث" پر ایک کتاب (DETRINI TATE) لکھی[1] آہستہ آہستہ وہ تازہ دم ہو رہا تھا۔ اور ایک دن اپنی پرجوش ذہانت کے ساتھ پھر میدان میں آگیا اب فرانس ایک بار پھر اس کی سحر انگیز تقریروں سے جھوم رہا تھا تاریخ فلسفہ کے مصنفین کہتے ہیں کہ قرون وسطیٰ کے فلسفیوں میں وہ پہلا شخص تھا جس کی علمی تقریروں میں ہزاروں افراد انتہائی شوق سے شریک ہوتے تھے۔ وہ کہتا تھا کہ میں ان لوگوں سے سخت نفرت کرتا ہوں جو عقیدہ پرست ہیں اس نے کھل کر اعلان کیا کہ یونانی فلسفے کے مقابلے میں بنی اسرائیل کے صحیفوں کی کوئی اہمیت نہیں آسمانی کتابیں "اخلاقی نقطہ نظر سے فلسفیانہ خیالات کے مقابلے میں پست ہیں۔

وہ فلسفہ جبر کا قائل تھا۔ دالتر غالباً انہیں خیالات کے باعث کہا کرتا تھا کہ ابیلارڈ فرانس کی چار بھول بھلیوں میں سے ایک تھا اور باقی تین بھول بھلیاں لامارٹن، میرے اور مولگرٹ

[1] اس کے علاوہ غالباً اسی زمانے میں اس نے "خطوط" اور (NOSCELE IMPSUM) کو مرتب کیا۔ (جولن ویلیا)

ہیں۔ آخر کلیسا نے اس کی کتابوں پر پابندی عائد کر دی اور بعض کو جلوا دیا۔ اسی زمانے میں وہ سینٹ گلڈاس کے گرجا کا رئیس خانقاہ مقرر ہوا ۔ یہ ۱۱۳۶ء کے واقعات ہیں ۔ نوجنٹ سرسین ۔ میں اس نے ایک چھوٹا سا خوبصورت گرجا بنوایا اور جب سینٹ گلڈاس کا رئیس خانقاہ مقرر ہوگیا تو یہ گرجا اپنی محبوبہ کے سپرد کر دیا۔ وہ اپنی کھوئی ہوئی عظمت و شہرت دوبارہ حاصل کر چکا تھا۔ اس نڈر اور شعلہ نفس مقرر نے پیرس میں انتہائی جرأت مندانہ تقریر کی۔ یہ تقریر توقع کے مطابق پادریوں کو بے حد ناگوار گزری چنانچہ سوسون کی کونسل اور پاپائے روم نے اسے ناجائز قرار دیدیا۔ ابیلارڈ اپنے خیالات کی یہ توہین اور کلیسا کے کٹر مذہبی حلقے کی یہ بیہودگی کسی طرح برداشت نہ کر سکتا تھا۔ حالات کی پیہم مزاحمتوں نے اسے تھکا دیا تھا۔ اس نے اپنے خیالات کے اظہار میں اپنے سینے کے تمام سانس صرف کر دیئے تھے۔ آخر اس کی صحت بگڑنے لگی اور حالت روز بروز خراب ہوتی چلی گئی۔ فرانس کی سماعتوں پر چھا جانے والا یہ مقرر اب کچھ کہتا تھا تو یہ معلوم ہوتا تھا کوئی محروم و مایوس روح کسی اذیت سے کراہ رہی ہے۔ اس کی شعلہ بیانی فریاد بنکر رہ گئی تھی۔ زندگی کی آگ بجھ رہی تھی۔ کاش اس کی ہیلیس کبھی ان ساعتوں میں اس کے قریب ہوتی۔

زندگی کے تمام رشتے ٹوٹ رہے تھے ہر سانس پر نزع کا عالم طاری تھا۔ آخر ایک دن ۔۔۔۔ اور وہ دن بہت ہی اُداس اور ویران تھا ۔۔ انتہائی مایوسی، دلشکستگی، تلخ کامی اور تنہائی کے عالم میں قرون وسطی کا یہ مایۂ ناز فلسفی۔ جاہل اور بے رحم دنیا سے تنگ آکر سقراط اور افلاطون کے پاس چلا گیا۔ اور کلیسا کی دلی مرادیں بر آئیں۔ اس کی لاش۔ سینٹ مارسیل ۔ کے گرجا میں رکھدی گئی تاکہ لوگ عبرت حاصل کریں۔ یہ ۲۱ اپریل ۱۱۴۲ء کا واقعہ ہے۔

آخری دیدار

یہ لاش کسی اور کی نہیں ابیلارڈ کی تھی۔ اگرچہ زمانہ بدل چکا تھا مگر پھر بھی دلوں میں اس کی عظمت کے نقوش باقی تھے۔ لوگوں نے سنا تو اپنے فلسفی کا آخری دیدار کرنے کے لیے گرجا کی طرف دوڑے ۔۔ مرنے والے سے دنیا ناراض تھی مگر دل کہہ رہے تھے کہ مقدس انسان تم پر آسمانوں کی رحمتیں نازل ہوں۔ ہجوم پر ایک سوگوار سکوت طاری تھا کہ ناگہاں کس نے یہ دیکھا کہ دنیا کی ستائی ہوئی ایک خانماں برباد روح گرجا میں داخل ہو رہی ہے ۔ یہ ایک ۔ راہبہ ۔ تھی ۔ زمانہ حسن ۔ وقار اور تمکنت کے جسموں کو اس طرح برباد کرتا ہوا گزر جاتا ہے کہ جاننے والے بھی انھیں نہیں پہچانتے ۔

> اجتماع میں پیرس کے معزز ترین اور امیر کبیر گھرانے کی ایک حسین، باوقار، سنجیدہ اور
> سراپا تمکنت دوشیزہ بھی بیٹھی تھی ۔۔۔۔ اور ابیلارڈ کی تقریر کے ایک ایک لفظ کو انتہائی غور
> سے سن رہی تھی ۔۔۔۔ تقریر ختم ہوگئی مگر اسے معلوم ہی نہ ہوا ۔۔۔۔ آخر وہ ہجوم کے درمیان
> سے گزرتی ہوئی ابیلارڈ کے سامنے پہنچ گئی ۔۔۔۔

وہ ایک لمحہ کے لئے رکی اور دیوانہ وار لاش کی طرف دوڑی ۔ میرے مالک میں آگئی
میرے دیوتا یہ کیا ہوگیا۔
لوگو بتاؤ! کیا میں بہت دیر سے پہونچی ہوں؟
حاضرین نے مرنے والے کی حقیقی سوگوار اور لاش کی تنہا وارث کو پہچان لیا ۔۔۔۔ راہبہ ۔۔۔ نے اپنے عظیم محبوب ۔۔۔۔

سالومی .... اپنے ہونٹوں کو مجھے چومنے دو
یوحنا .... لعنتی زانیہ ماں کی بیٹی
تخلیقی جمال و جلال کا بیمثال صحیفہ۔ عظمتوں کا مہتم بالشان لہجہ
سالومی
عبدالعزیز خالد کی تمثیل جمیل
قیمت:- ۸؍عہ

حسنین کاظمی

خانم سیمین بہبہانی

نہیں میرے ہونٹوں کو نہ چومو! —— ان میں زہر ہے ——
مجھے اپنے بازوؤں میں نہ لو! —— میں آگ ہوں
—— میرے سینے سے کہیں تمہارا سینہ جل نہ جائے ——
اور کہیں یہ آگ ——

تہران کی ایک برفانی رات تھی۔ کوہ البرز سفید نورانی چادر اوڑھے چاندنی کے سناٹے میں محوِ خواب تھا اور دماوند کا دیو۔ سر سے سفید صافہ باندھے کوہستانی دوشیزہ کے سرہانے پہرہ دے رہا تھا۔ کئی دن سے مسلسل برف گر رہی تھی۔ اور اب جو ذرا آسمان کی تاریکیوں میں چاند مسکرایا تھا تو منجمد زندگی میں حرکت پیدا ہو گئی تھی۔ آہوانِ ختن۔ پری وشانِ خاف اور سیاہ چشمانِ شیراز کے پرے بازاروں میں نکل آئے تھے ہر طرف چاندنی ہی چاندنی تھی۔ چاند کی چاندنی۔ برف کی چاندنی۔ شاید انہی دلفریب اور دلکش مناظر کو دیکھ کر میرے جذبات اور احساسات چاندنی جیسے سفید کاغذ پر گر کر مچل رہے تھے

آن سوزِ عشق و شورِ محبت کہ داشتیم — در اصفہان و مشہد و تہران فروختیم
ہر چیز ز نقدِ عشق شد و صبر ماندہ بود — آنہم بیک تبسمِ جانان فروختیم
کالائی عشق اینقدر ارزان نبود شاد — صد آرزو بہ جنبشِ مژگان فروختیم

رات سرد تھی، بے حد سرد اور روشن۔ چاند مسکرا رہا تھا کہ یکایک سیمین مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ آتشدان میں دہکتے ہوئے انگاروں کے پھول مرجھانے لگے بجھنے لگے۔ کون جانے سیمین کو دیکھ کر یا برفیلی ہوا سے جو کواڑوں میں سے چوری چوری کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ رات بھیگ چلی تھی۔ گرم محفل سرد ہو چکی تھی۔ سب جا چکے تھے۔ مشاعرہ ختم ہو چکا تھا۔ علامہ ہادی حائری استاد دانش گاہ مشہد۔ آقائے ادیب برومند اور آقائے گلچین معانی رخصت ہو رہے تھے۔ سیمین کے آتے ہی یہ حضرات بھی بیٹھ گئے اور اب بساطِ ادب کے یہ ناز والا ہدیہ مہرے یکے بعد دیگرے گویا ہوئے اور برف کے بعد...... اب شعروں کی بارش ہو رہی تھی۔

سیمین نے ایک غزل سنائی —— "گل ریختہ"

آں دیدہ کہ با مہر بسویم نگراں بود — دیدم کہ نہانی نظرش با دگراں بود

آن اختر تابندہ کہ پنداشتمش عشق ، تا سوئے من آمد چو شہابی گزراں

"وہ محبت بھری آنکھ جو مجھے شکی بادرے دیکھ رہی تھی میں نے دیکھا کہ وہ کنکھیوں سے اوروں کو بھی دیکھتی جاتی تھی۔ وہ روشن ستارہ جسے میں عشق سمجھے ہوئے تھی میرے نزدیک سے یوں گزر گیا جیسے شہاب ثاقب۔"

علامہ حائری آقائے ادیب اور آقائے گلچین جا چکے تھے۔

سیمین سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ آتشدان کے انگارے اس کے چہرے پر دہک رہے تھے۔ اس کا چہرہ شوخی اور حیا کا بہت ہی پیارا سنگم تھا۔ وہ معانی کی خواستگار اور میں سراپا عجز و انکسار۔ وہ میری مہمان تھی۔

"معاف کیجیے گا مجھے دیر ہو گئی۔ سواری نہ مل سکی۔ برفانی راتیں ہیں نا۔ اور پھر آپ کا گھر بھی آسانی سے نہ مل سکا۔ پتہ کہیں گم ہو گیا تھا۔"

"اس وقت آکر آپ نے اپنے اخلاق کی بلندی کا ثبوت دیا ہے۔ آپ آسانی سے کوئی بھی عذر پیش کر سکتی تھیں اور اگر نہ بھی آتیں تو میں کیا کر لیتا۔ یہ تو میری خوش نصیبی ہے۔ دیر میں آئی ہیں۔ دیر تک بیٹھیں گی۔"

وہ صرف مسکرا دی۔ کمرے میں بجلی سی چمکی۔ باہر آسمان پر بادل جمع ہو رہے تھے۔ اور میں سوچنے لگا۔

"الٰہی یہ گھٹا دو دن تو برسے۔"

پھر میں سوچنے لگا ہماری اردو شاعری جادۂ ترقی پر رواں دواں کتنی آگے نکل آئی ہے کہ فارسی شاعری اس کی گرد راہ کو بھی نہیں پا سکتی۔ بھلا یہ باتیں فارسی شاعروں کو کہاں نصیب ہوتی ہیں۔ اسی لئے تو فارسی شعرا "سبک ہندی" یعنی برصغیر کی اردو فارسی شاعری کے اسٹائل پر جان دیتے ہیں اور آج کل ایرانی شعرا بیشتر ہماری شاعری کی پیروی کرتے ہیں۔

ایران میں اس انداز سخن کا موجد صائب تھا۔ سیمین صائب کی تاسی ہیں اس کا شعر پڑھ کر تعلّی کیا کرتی ہے۔

صائب کسی بہ رتبۂ شعرم نمی رسد ، دست سخن گرفتم و بر آسمان شدم

آقائے استاد امیری فیروز کوہی۔ رہی معیری۔ گلچین معانی۔ خانم سیمین بہبہانی اور سینکڑوں دوسرے شاعر اس انداز شاعری پر سر دھنتے ہیں اور یہی انداز سخن انکی شاعری کی ان اور ان کا محبوب انداز ہے۔

لیجئے میں بہتا بہانہ جانے کہاں نکل گیا۔ بات ہو رہی تھی بادلوں کی۔ بادل گھر گھر کر آرہے تھے اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر سیمین یہیں گھر گئی تو پھر گھر کیسے جائے گی۔ لیکن سیمین کو فکر نہ تھی۔ وہ تہران کے گلی کوچوں سے واقف تھی۔ وہ تہران میں پیدا ہوئی۔ پلی بڑھی، وہ کسی اجنبی شہر میں نہ تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ وہ کہنے لگی۔ چلی جاؤں گی، ایسی بھی کیا جلدی ہے رات تو اپنی ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے۔ دل تو یہی چاہتا ہے کہ یونہی بیٹھے شعر و شاعری کرتے رہیں اور صبح کی کرن کے ساتھ ہی مقطع پڑھیں۔ لیکن مجھے آپ کا خیال ہے۔ اگر برف گرنی شروع ہو گئی تو پھر سواری کا ملنا دشوار ہو جائے گا۔"

"تو پھر کیا ہوا میری چھوٹی بہن کا گھر یہیں نزدیک ہی ہے۔ وہاں چلی جاؤں گی۔"

"ہاں تو پھر کوئی مضائقہ نہیں۔ بسم اللہ۔ ہو جائے کوئی تازہ غزل۔"

کئی غزلیں سنیں۔ قطعات سنے نظمیں سنیں۔ پھر سوالوں کی بوچھار کر ڈالی جس سے میری معلومات کے خزانے میں کافی اضافہ ہوا۔ سیمین ۱۹۲۷ء میں ایک ادیب گھرانے میں پیدا ہوئی۔ باپ آقائے عباس خلیلی۔ بابائے صحافت۔ بلا کا ذہین اور غضب کا لکھنے والا۔ "اقدام" ایران کا پرانا اور

مشہور اخبار جس کی ادارت آج تک اُن کے سپرد ہے۔ ماں - بانو فخر عادل - ایران کی مشہور شاعرہ - ادبیات فارسی کی منتہی - فرانسیسی اور انگریزی زبانوں سے آشنا۔ سیمین نے ایسے گھرانے میں آنکھیں کھولیں ۔۔ شعر و شاعری اس کی گھٹی میں پڑی تھی ۔

بچپن ہی سے شعر کہنا شروع کیا۔ عنفوان شباب میں شاعری سے عشق و علاقہ اور بڑھا۔ پھر کسی سے محبت ہوگئی سمند نازکو اک اور تازیانہ ہوا۔ شاعری کی چنگاری۔ عشق کی ہوا۔ اور پھر تو یہ چنگاری بھڑک کر شعلہ بن گئی جس نے جوان ایران کے سینے میں آگ لگا رکھی ہے۔ نوجوان ہیں کہ سیمین کی آتشیں شاعری پر سر دھنتے ہیں۔ سیمین خود اس آگ میں جل کر خاک ہو چکی ہے۔ اس کے شعر اس کے جلتے ہوئے آنسو ہیں۔ جو اس نے جدائی کی طویل راتوں میں اپنی بڑی بڑی شربتی آنکھوں سے بہائے ہیں۔

اس کی زندگی شعر۔ اس کی گفتگو شعر۔ وہ مجسم شعر ہے۔ حافظ کی ایک حسین ترین غزل ۔ خیام کی ایک مصور رباعی جسے بہزاد کی ماہر انگلیوں نے جنم دیا ہو۔ سعدی کا ایک تابندہ و درخشندہ پند جو زندگی کے لئے مشعل راہ ہو۔ مولوی کی مثنوی۔ مثنوی کی روح۔ مثنوی کی درد بھری لے ۔۔۔ فردوسی کے شاہنامہ کی تہمینہ ۔

سیمین کی کاوشوں کا نتیجہ ۷۰۰۰ ہزار اشعار ہیں جو " سہ تار شکستہ" "جای پا" اور "چلچراغ" کی صورت میں جلوہ گر ہو کر داد سخن حاصل کر چکے ہیں۔ اور جب کسی رنگین محفل میں سیمین اپنے ان اشعار کو وائلن پر الاپتی ہے تو پھر اس کے ان جواہر پاروں کو چار چاند لگ جاتے ہیں ۔

اس کا عشق بے پایاں اور عالمگیر ہے۔ اس کا عشق شراب کا نشہ نہیں جو چڑھ کر اُتر جائے۔ اس کی شاعری کا لوہا سب مانتے ہیں۔ فن شعر میں اس کی شان گویائی بے مثال ہے۔

اس کی شاعری میں بلا کا درد ہے گھٹی گھٹی ہچکیاں ہیں۔ اُسے اپنی زندگی میں کبھی چین نصیب نہیں ہوا۔ اُس نے اپنے گرد ایک غم واندوہ سے بھرپور دُنیا دیکھی۔ میں نے پوچھا " سیمین تمہاری شاعری میں ایک عجیب قسم کا کرب ہے۔ آخر کیوں" اُس نے ایک آہ سرد بھری ۔

" یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ اس کا میری شاعری سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ اگر وہ نہ ہوتا تو یہ بھی نہ ہوتا۔"

" یہ تو ایک چیستان ہو گئی۔ اگر وہ نہ ہوتا تو یہ بھی نہ ہوتا۔ آخر بات کیا ہے۔"

" ابھی آپ نے ایک نظم سُنی جس کا عنوان تھا " داستانِ زندگی" یہ نظم میری آیات زندگی کی تفسیر ہے۔ یہ میری اپنی کہانی ہے غمگین کہانی۔ جس نے میری زندگی کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ اگر میری زندگی میں یہ حادثہ ظہور پذیر نہ ہوتا تو آج میں کچھ اور ہوتی۔ کیا آپ جانتے ہیں سیمین بہبہانی میرا تیسرا نام ہے؟ پہلے میرا نام سیمین خلیلی تھا۔ پھر سیمین خلعتبری ہو گیا اور اب سیمین بہبہانی ہے ۔

آقائے عباس خلیلی نے خانم فخر عادل سے شادی رچائی اور جب میں پیدا ہوئی تو میرے والدین ایک دوسرے کے نہ بن سکے۔ انکے دل پھٹ گئے اور وہ ہمیشہ کے لیے جُدا ہو گئے۔ میں اپنی ماں کے ساتھ رہی۔ اُنہوں نے آقائے عادل خلعتبری سے شادی کر لی۔ یہ زمانہ میں نے اپنے باپ کے ہاں گزارا۔ جو میرا باپ نہ تھا اور جب سے میں ۱۹ سال کی ہوگئی تو مجھے آقائے حسن بہبہانی کے سپرد کر دیا گیا۔ ہم دونوں ایک جان دو قالب ہیں۔ میں شمشیر ہوں اور وہ ڈھال۔ اور ہم ظالم دنیا سے لڑ رہے ہیں۔ بظاہر یہ ایک معمولی سا واقعہ ہے لیکن ان حادثات نے مجھے جو صدمے پہنچائے ہیں وہ میرا زخمی دل ہی جانتا ہے۔ میں نے اپنی نظم "داستانِ زندگی" میں انہی واقعات کو قلمبند کیا ہے۔ "اے ہم نفس میرے نزدیک نہ آ۔ میں مجسم کینہ ہوں۔ بغض ہوں ۔۔۔ خشم ہوں۔ میرے ہونٹوں کے بوسے نہ لے۔ ان میں زہر ہے۔ میری مسکراہٹ میں بغض اور کینے کے نشتر چھپے ہوتے ہیں۔ مجھے اپنے بازوؤں میں لے کر اور میرے سینہ سے سینہ ملا کر فشار نہ دے۔ میرے سینہ میں آتشِ انتقام کے شعلے بھڑک رہے ہیں۔ میں ڈرتی ہوں کہ کہیں یہ آگ تجھے بھی جلا کر خاکستر نہ

کرڈالے۔ تو مجھ سے محبت مانگتا ہے لیکن میں شمشیر کی طرح سرد اور بے رحم ہوں۔ چوٹ کھائی ہوئی ناگن ہوں۔ مجھے میرے تاریک اور غمگین ماضی کی یاد نے مار ڈالا ہے۔

یاد دارم زِ اجتماعِ پلید — کہ دو تن را عبث بہم پیوست،
من شدم یادگارِ این پیوند — لیک چون رشتہ سست بود گسست

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس ناپاک اور پلید دنیا نے دو دیوانوں کو ایک بندھن میں باندھ دیا۔ اور میں اس رشتہ کی یادگار ہوں۔ چونکہ یہ بندھن کمزور تھا آن کی آن میں ٹوٹ گیا۔

پھر میں تنہا رہ گئی۔ آہستہ آہستہ میرے سینہ میں بغض اور عداوت کے زہریلے ناگ پرورش پانے لگے۔ بچپن گزر گیا، وہ بھولا بچپن جو سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی کچھ نہ سمجھ سکتا تھا۔ جوانی آئی۔ کہتے ہیں جوانی دیوانی ہوتی ہے لیکن میری جوانی بہت سمجھدار تھی۔ میں نے اپنے غموں کو بھلا دیا اور دنیا کے درد و غم میں کھو گئی۔ میں نے وہ سارے مصائب و آلام دیکھے جس میں ملک کے عوام مبتلا ہیں۔ میں نے ایسے حریت پسند بھی دیکھے جنھوں نے مسکرا مسکرا کر جان دیدی لیکن ظلم و جبر کے سامنے سر تسلیم خم نہ کیا۔ دنیا کے اس دردناک المیہ نے میری کمر توڑ دی ہے۔ مجھ سے اب یہ باتیں نہیں دیکھی جاتیں۔ اب میں سراپا انتقام ہوں۔ اے ہم نفس مجھ سے دور . . . . بہت دور چلا جا۔ میں ایک خنجر ہوں۔ زہر میں بجھی ہوئی تلوار۔ میں آگ ہوں آگ۔ جو ایک نہ ایک دن خرمن جور و ستم کو جلا کر خاکستر کر ڈالے گی۔

خنجرم خنجرم کہ تیزی خویش — بر دلِ خصم خیرہ بنشانم
آتشم آتشم کہ آخر کار — خرمنِ جور را بسوزانم

سیمین کی زندگی اور شاعری عوام کے لئے وقف ہو کر رہ گئی ہے۔ وہ دنیا کو ان بیچاروں کے قصے سناتی ہے تاکہ جنتوں میں رہنے والے خواب خرگوش سے چونکیں اور ان بدنصیبوں کی جہنم زار زندگیوں کو کم از کم چند لمحوں کے لئے ہی خوشگوار بنا سکیں۔ سیمین نے اپنا آرام، اپنی خوشی، اپنا عیش، اپنی مسرتیں، اپنا سب کچھ تج دیا ہے۔

اپنی نظم "جامۂ عید" میں اسنے غریبوں اور بے نواؤں کی دلداری کی ہے۔ "میں نے اپنے گھر کو سجایا۔ پھولوں کے ڈھیر لگا دیئے۔ بچہ کو نئے کپڑے پہنائے گھر میں خوشیاں اور مسرتیں ناچ رہی تھیں۔ بچہ گھر سے باہر چلا گیا تھا کہ ہمجولیوں میں بیٹھ کر کھیل سکے۔ خوش و خرم ہو سکے۔ تھوڑی دیر بعد وہ گھر میں آیا۔ اس کے کپڑے میلے ہو گئے تھے، دھبے پڑ گئے تھے۔ اور وہ رو رہا تھا۔ میرے کپڑوں پر یہ دھبے نہیں ہیں بلکہ ان میلے کچیلے بچوں کی آنکھیں ہیں جو مجھے غصہ نفرت کینہ اور حسد سے دیکھ رہے تھے۔ میں اب باہر نہیں جاؤں گا مجھے شرم آتی ہے کہ میں اس طرح کھیلتا کودتا پھروں اور وہ بچارے خزاں زدہ شاخوں کی طرح عریاں ہوں۔

یا مرا عریاں چو عریانان بساز — یا لباسی ہم پی آنان بساز

"یا تو مجھے بھی ان ننگوں کی طرح عریاں کر دو یا پھر ان کے لئے بھی کپڑے بناؤ۔

گفتمش آنان کہ مال اندوختند — از تو کاش این نکتہ می آموختند
کاخشان ہر چند نغز و پربہاست — نقش دیوارش زخشم چشمہاست
گر شرابی در گلوشان ریختہ — حسرت خلق بدان آمیختہ،

"میں نے اس بچے سے کہا کہ اے کاش سرمایہ دار تجھ سے سبق لے سکتے۔ ان کی کوٹھیاں آراستہ و پیراستہ ہیں لیکن ان کی کوٹھیوں کے نقش و نگار میں عوام کی آنکھیں غیظ و غضب سے گھور رہی ہیں۔ جس شراب عیش و طرب نے انھیں مست کر دیا ہے اس کے اندر غریب عوام کی محرومیاں اور تلخ کام حسرتیں گھلی ہوئی ہیں۔

دراصل سیمین حقیقت نگار ہے۔ اُس کی شاعری کے کردار وہ انسان ہیں جنھیں انسانوں ہی نے لوٹا ہے۔ تباہ کر دیا ہے۔ سیمین انہی کی پُر درد کہانیاں سناتی ہے۔ اُس نے اپنی ایک عظیم تخلیق "زن روسپی" میں ایک عصمت فروش عورت کے احساسات پیش کئے ہیں۔ وہ عورت ایک عصمت مآب خاتون تھی۔ لیکن ہمارے گھناؤنے سماج نے اُسے کوٹھے پر لا بٹھایا اور اپنی چہار دیواری سے ہمیشہ کے لئے باہر کر دیا۔ دنیا آرام کی نیند سو رہی ہے اور وہ بدنصیب آنسو بہا رہی ہے۔ کہ ناگہاں کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔

آه آن کیست که دری کوبد	همسر امشب من می آید
وائی ای غم ز دلم دست بکش	کاین زمان شادی او می باید

"آہ یہ کون ہے جو دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ شاید میرا آج کی رات والا شوہر آیا ہے۔ آہ اے غم اب مجھے اجازت دے، یہ وقت آنے والے شوہر کو خوش کرنے کا ہے ——"

ذرا دیکھئے تو ایک عورت کس طرح مجبور کر دی گئی ہے۔ اُسے پیٹ بھرنے کے لئے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ یہ کتنی المناک حقیقت ہے۔ اسے شدت غم میں اداؤں کی نمائش کرنی پڑتی ہے تاکہ اس کا گاہک اپنے پیسے وصول کر سکے۔

لب من ای لب نیرنگ فروش	بر غمم پرده ای از راز بکش
تا مرا چند درم بیش دهند	خنده کن بوسه بزن ناز بکش

"اے میرے فریبی ہونٹ میرے غم و اندوہ پر ایک پردہ ڈال دے اور تھوڑی دیر کے لئے تو مسکرا، بوسے لے اَدائیں دکھا تاکہ مجھے کچھ زیادہ پیسے مِل جائیں۔

اُف کتنی خطرناک ہے یہ زندگی! —— کتنی دردناک ہے یہ زندگی۔ اسی طرح اپنی ایک دوسری نظم "واسطہ" میں ایک دلّالہ کی دردبھری زندگی کی ایک جھلک دکھاتی ہے۔

نظم اس طرح شروع ہوتی ہے۔ بدنصیب اور معصوم عورتوں کو کھلنے والا ایک ریچھ ہے وہ دلّالہ سے کہتا ہے کہ روزانہ تو غازہ میں چھپے ہوئے مکروہ چہرے لاتی ہے آج کوئی سادہ سی دلفریب سی، اصل جیسے نوخیز کلی میرے لئے پھانس کر لا۔ دلّالہ ایک معصوم دوشیزہ کو پھانس کر لاتی ہے۔ جس کی سادگی پر ہزاروں بناوٹی حسن نچھاور کر دیئے جائیں۔ سماج کا وہ ریچھ لڑکی کے ساتھ کمرے سے باہر آتا ہے اور دلّالہ کو روپیہ دیتا ہے۔ دلّالہ اس واقعہ کا نقشہ کھینچتی ہے۔

این زر بگیر کز پی پاداشش	شایان مزد بیشتری تو
این گفتگو نرفته بپایان	بر دختر کم مرا نظر افتاد
آنگونه گشت حال که گفتم	کوبم به فرق مرد و زرش را
کای اژدها بیا و زر خویش	بستان و باز ده گهرش را

"یہ لے اپنا انعام ۔ آج تو طبیعت خوش ہوگئی۔ یہ بات ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ میری نظر اس دوشیزہ کے معصوم و مغموم چہرے پر پڑی اس کی غمگین آنکھوں میں شکووں کے دریا بند تھے ۔ دیکھتے ہی جیسے میرے تن بدن میں آگ لگ گئی ہو۔ شعلے سے بھڑکنے لگے میرے جسم میں۔ میرا جی چاہتا تھا کہ اس سفاک کے دیئے ہوئے چند سکے اس کے منہ پر ماروں اور کہوں کہ لے اُٹھا لے اپنی دولت اور اس کی دولت عصمت کو واپس کر۔"

دیکھئے شاعرہ نے ایک دلاّلہ کے کردار کا نقشہ کھینچکر اپنے فن کو کہاں پہنچا دیا ہے ۔ اور یہیں پر بس نہیں کرتی۔ دلاّلہ کے دل میں اخلاقی شعور اور انسانی احساس کی ایک جھلک دکھا کر شاعرہ مجبوریوں کے ہاتھ میں کھیلتے ہوئے اسکے کردار کا خاکہ پیش کرتی ہے۔

دلاّلہ کہتی ہے ۔

دیو درُون نہیب بمن زد   کاین زر ترا وسیلہ نان است
درکیسہ اشس نہفتم و بستم   زیرا زر است دلبستہ بجان است

"میرے دل میں چھپا ہوا دیو۔ لالچ اور بھوک کا دیو پکارا۔ بیوقوف تجھے اپنے پیٹ کا، پیٹ کے لئے دو روٹیوں کا بھی خیال ہے۔ چپکے سے ان روپیوں کو جیب میں رکھ لیا۔ چونکہ یہ مال ہے اور مال کا جان سے بڑا گہرا تعلق ہے ۔

یہ حقیقت نگاری اس کی شاعری کی جان ہے ۔ اس کا دردمند دل ایک وسیع میدان ہے جس میں لاکھوں بدنصیب انسان خیمے ڈالے پڑے ہیں۔ وہ تڑپتے ہیں۔ روتے ہیں سیمین کو اپنا دکھڑا سناتے ہیں اور سیمین اپنی شاعری کی تلوار کو ان غریبوں کی زندگی کے زہر میں بجھا کر باہر نکلتی ہے اور سماج کے ان درندوں کو تہ تیغ کرتی رہتی ہے ۔ اس کی زندگی مہتاب خزاں کے مانند۔ زرد۔ پھیکی اور بے جان ہے۔ "نغمہ ہائی درد" میں اس نے اپنی زندگی کی غمناک روداد بیان کی ہے۔ "کل کی سیمین" کو بھلا کر "آج کی سیمین" کا نقشہ کھینچا ہے ۔ وہ سیمین جو اب بالکل بدل چکی ہے۔ اس کی شاعری میں "ترانۂ ہجراں" "نغمہ ہائی درد" "فریاد شکستہ" "مہتاب خزاں" "سہ تار شکستہ" اور دل بے ہنر" جیسے عنوانات نظر آتے ہیں۔ کہتی ہے۔ اے میرے غمگسارو! میرے نغمات درد سنکر تم غمگین ہو جاؤ گے مگر میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں کہ تمہاری سیمین کبھی کیا تھی اور اب کیا ہوگئی ہے ۔

"یہ میں ہوں ۔ اے میرے ہمدرد یہ میں ہوں۔ سرد چنگاری جو خاکستر ہوگئی ہو۔"

"یہ میں ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ایک مرجھایا ہوا پھول جس کی پنکھڑیاں بکھر چکی ہوں۔"

"یہ میں ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ایک نغمہ جو عشق کے تاروں کی چھیڑ سے فضا میں گونجا اور پھر آہستہ آہستہ خاموشیوں کی گود میں سو گیا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ۔

"یہ میں ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سینکڑوں آرزوؤں اور تمناؤں کی ایک لاش جسے سب بھول گئے۔

میں ایک مسکراہٹ تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ زندگی کے ہونٹوں کی زندۂ جاوید مسکراہٹ۔

کبھی میں آرزو کی آنکھوں میں چمکتی تھی، لیکن اب اشک خونین اور درد بے درماں ہوں۔ آہ! میں افسردہ ہوں۔ وہ میری جاں بخش مسکراہٹ اور روح پرور قہقہے کیا ہوئے ۔ اے میرے دوستو! کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ میں ہی ہوں۔ یہ بے روح خشک باغ جسے خزاں کی آگ کھا گئی ہے ۔ "کیا تم نے باور کر لیا ہے کہ یہ شام بے ستارہ "تمہاری سیمین ہی ہے۔"

اس کے محبوب نے اُسے بھلا دیا ہے اور کہیں دُور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دنیا اور اس کی آنکھوں سے دور چلا گیا ہے لیکن وہ اپنے محبوب کی یاد کو سینہ سے لگائے بیٹھی رہی ہے محبوب کی یاد اُسے آ آکر ستاتی ہے۔ وہ کہتی ہے ۔

ای سایهٔ لاغر زمن چه خواهی؟ دست از مِن رنجدیده بردار
برخاطرِ خسته ام ببخشائی بگذار مرا بخویش بگذار

"اے میرے محبوب - اے میرے محبوب کے خیال - اے میرے محبوب کے سائے - تو مجھ سے کیا چاہتا ہے - مجھ غمزدہ کو نہ ستا — مجھ خستہ حال کو معاف کر — اور مجھے میرے اپنے حال پر چھوڑ دے ۔"

گاہی بشتاب پیشم آید برسینهٔ من نهد سرِ خویش
برآتش سینه ام زند آب بااشک دو دیدهٔ ترِ خویش

"کبھی وہ بجلی کی طرح آتا ہے اور میرے سینہ پر اپنا سر رکھ دیتا ہے - میرے سینے میں بھڑکتی ہوئی آگ پر اپنی نمناک آنکھوں کے آنسوؤں سے پانی چھڑکتا ہے ۔"

گر بوسه رُباید از لبِ من آں سایهٔ دلکش خیالی
بیخود شوم و بخود چو آیم او رفته و جائی اوست خالی

" اور جب وہ خوبصورت خیالی سایہ میرے ہونٹوں کے بوسے لیتا ہے تو میں بیخود ہو جاتی ہوں اور جب میں ہوش میں آتی ہوں تو وہ سایہ نظر نہیں آتا —"

این سایه که هر کجاست بامن جز آن مه شوخ خونریز نیست
بامن شب و روز گاه و بیگاه او هست و هزار حیف او نیست

" یہ سایہ جو ہر جگہ میرے ساتھ ہے - یہ کیا ہے یہ خود وہی ہے - میرا محبوب — یہ سایہ دن رات میرے ساتھ رہتا ہے - لیکن افسوس - خود وہ — میرا محبوب مجھ سے دور ہے -

ایک رات اور یاد آگئی - بڑی اچھی رات تھی وہ -

سیمین کے ہاں ایک محفل تھی - یادگار محفل کہوں تو بہتر ہو گا ایسا پاک و پاکیزہ منتخب اور مخصوص مجمع میں نے کسی اور ادبی محفل میں کبھی نہ دیکھا - کم از کم تہران میں اپنے پنج سالہ دوران قیام میں تو مجھے کہیں نظر نہ آیا - چوٹی کے ادیب و شاعر - منتخب کلام - اور بے لاگ تنقید - ایرانی ادیب اور شاعر تنقید کے قائل نہیں - اگر کسی کے شعر پر اعتراض کیا جائے تو وہ بُرا مان جاتا ہے اور معترض عمر بھر کے لیے بُرا بن جاتا ہے شعر و ادب کی تنقید کو وہ اپنی توہین و تضحیک تصور کرتے ہیں - اور شاید اسی لئے جدید فارسی ادب میں محاسن سے زیادہ معایب پائے جاتے ہیں - لیکن اُس رات یہ بات نہ تھی - ایرانی ادبیات کی جدید تاریخ میں واقعی عجیب و غریب بات تھی -

ہاں تو سیمین نے اس رات دونوں غذائیں بہم پہونچائی تھیں ، غذائے روحانی اور غذائے جسمانی — مرغ و ماہی -

کھانے کے بعد سیمین نے غزل شروع کی -

امشب از غمت ای بتِ آشوب گرِ من آتش زند دلم خیزد و آه از جگر من
هر چند نهان میکنی آتش میکند فاش چشمان سخنگوی تو این راز بر من
آن طرفه نگاهت که صفا داشت چو مهتاب اکنون چه شدی دلبر من نیشتر من؟

امشب فلک از دختر تابندہ نداد   اختر فشد از دیدۂ اختر شمر من

"اے میرے فتنہ ساماں محبوب - آج کی رات تیرے غم میں - تیرے فراق میں، میرے دل میں آگ کے شعلے بھڑک رہے ہیں اور جگر سے آہ نکلتی ہے۔"

"ہر چند تم اس راز کو چھپاتے ہو لیکن تمہاری آنکھیں تو سب کچھ کہے دے رہی ہیں - تمہارے سارے راز مجھ پر فاش ہو گئے ہیں۔"

"اے میرے چاند - میرے محبوب - اگر آج کی رات آسمان کے چاند کے بجائے تو میرے پہلو میں آجاتا تو کوئی بڑی بات تھی آخر تیرا کیا بگڑ جاتا؟"

"وہ تیری طرفہ نگاہیں جن میں مہتاب چمکتے تھے - اب کیوں بدل گئی ہیں اب انھیں کیا ہو گیا ہے میرے پیارے۔"

"اگر آج کی رات آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے نہیں ہیں تو کیا ہوا میری اختر شمار آنکھوں سے جو تارے نکل رہے ہیں۔"

دو بجے رات تک محفل جمی اور پھر سب اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے - ایک دن میں نے سیمین سے پوچھا - تم نئی اور پرانی شاعری کی استاہو - لیکن تمہارے شعروں میں کہیں کہیں یہ عریانی سی کیوں ہوتی ہے - گرم گرم بوسوں کا ذکر - بغلگیر ہونا - وغیرہ وغیرہ۔

کیا یہ تمہارے ذاتی جذبات و احساسات ہیں یا دوسروں کے جذبات کی عکاسی کرتی ہو۔

مسکرا کر کہا - "کچھ بھی سمجھ لیں - لیکن یہ عکاسی حقیقی ہے افسانوی نہیں"

میں اپنے دل کی بات شعروں کی زبان میں ادا کرتی ہوں - میرے شعر میرے جگر پارے ہیں جنھیں میں نے اپنے خون جگر سے سینچا ہے۔

میں نے زہرؔ لکھنوی کا شعر جس کا ذکر تذکرۃ الخواتین میں آیا ہے اور بڑے پائے کی شاعرہ تھی، سنایا۔

ہی ہی چہ بی حیا ست کہ در پیش مردماں
پروانہ را ببزم بغلگیر کردہ شمع،

"ہائے یہ شمع کتنی بے حیا ہے کہ بھری بزم میں پروانہ سے بغلگیر ہوتی ہے - آنکھوں کے سامنے پروانہ سے لپٹ جاتی ہے۔"

ظالم کس انداز سے سارا مطلب ادا کر گئی ہے اور کہیں پر بھی عریانی نظر نہیں آتی۔

سننے والے اس شعر کو سنکر تڑپ اٹھے - سیمین کی ترقی پسند شاعری، بے سر و پا شاعری نہیں - اس کا نظریہ ہے کہ تخیلات، احساسات اور تجربات نئے ہوں اور شعر کا قالب وہی کلاسیکی ہو جو شعر میں نغمگی پیدا کرتا ہے۔

سیمین کا کہنا ہے کہ "ایرانی اس زبان میں شعر کہتا ہے جو شیریں، لطیف، سادہ اور دلکش ہو اور، ردیف، قافیہ، اور آہنگ کے زیورات سے بھی مزین ہو۔

واقعی یہ کمال سیمین ہی کو حاصل ہے کہ اس نے نئے اور پرانے چراغ اس طرح ایک جگہ روشن کئے ہیں کہ اگر افریقہ کا جادوگر بھی دیکھے تو اُسے دھوکا ہو جائے۔

(باقی از صکا)

———— برگشتہ حال شوہر ———— کے پاک اور پاکیزہ جسم کو دفن کیا اور اپنی سوگوار تنہائیوں میں لوٹ گئی ———— اب تین مہینے گزر گئے تھے ———— اس دوران میں وہ لوح تربت کی طرح ساکت و جامد رہی ———— اور ایک دن اپنے بچھڑے ہوئے ساتھی سے جا ملی ———— یہ غالبؔ جولائی ۱۷۹۱ء کے آخری دنوں کی بات ہے ———— آج سے ۱۸۸ سال پہلے فرانس میں ————

(جون ایلیاؔ)

آمین الرحمٰن

برگساں

تا بر تو آشکار شود رازِ زندگی — خود را جدا ز شعلہ مثالِ شرر مکن
بہر نظارہ جز نگہِ آشنا میار — در مرز و بوم خود چو غریباں گذر مکن
نقشے کہ بستہ ای ہمہ اوہام باطل است — عقلے بہم رساں کہ ادب خوردۂ دل است

اپنے ان تین شعروں کے نرم اور نازک لفظوں میں علامہ اقبال نے "پیامِ مشرق" میں نہایت حسن و خوبی سے برگساں کے دقیق اور پیچیدہ فلسفہ کا خلاصہ بیان کر دیا ہے۔ ہنری برگساں جس نے ۱۹۴۱ء میں وفات پائی تھی۔ بیسویں صدی کے بہترین فلسفیانہ دماغوں میں سے تھا ہم پاکستان والوں کو اس کی ذات اور فلسفے سے اس لئے دلچسپی ہونی چاہیے کہ اس نے ہمارے شاعر اقبال کو اپنے فلسفے سے بہت متاثر کیا تھا۔ نہ صرف علامہ اقبال کے کلام میں اکثر جگہ برگساں کے فلسفیانہ خیالات کا حوالہ ملتا ہے بلکہ علامہ اقبال کے اُن لیکچروں میں بھی جو "الٰہیاتِ اسلام کی تشکیلِ جدید" کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں برگساں کے نظریۂ زمان و مکان کا بار بار ذکر ملتا ہے۔ خاصکر مذہبی تجربے کے وجدان سے متعلق اُن کا جو لیکچر ہے اس میں برگساں کے نظریۂ زمان و حرکت کا خصوصیت سے ذکر ہے۔

ہنری برگساں ۱۸ اکتوبر ۱۸۵۹ء کو پیرس میں پیدا ہوا۔ اُس کے ماں باپ انگریز اور یہودی نژاد تھے۔ سکول اور کالج کے زمانے میں وہ ایک نہایت ذہین اور کامیاب طالب علم تھا۔ طالب علمی کے زمانے ہی میں اس کے ذہن میں ایک کشمکش موجود تھی کہ وہ ادب کا طالب علم بنے یا سائنس کا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ وہ نہ تو ادب کا طالب علم بنا اور نہ سائنس کا بلکہ فلسفے کا — لیکن اس کشمکش نے اس کی فلسفیانہ تحریروں میں ایک طرف تو ادبی رنگ پیدا کر دیا اور دوسری طرف اس کے فلسفیانہ استدلال کو ایک باقاعدہ طریقے سے پیش کرنے میں بہت مدد دی۔ طالب علمی کی زندگی کے بعد ہنری برگساں فرانس کی بعض ممتاز درسگاہوں میں فلسفے کا درس بھی دیتا رہا۔ کچھ عرصہ بعد اس نے فلسفے کی درس و تدریس کو خیرباد کہہ کر سیاسیات اور بین الاقوامی مسائل میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ پہلی جنگِ عظیم کے بعد وہ "ذہنی تعاون و اشتراک کی کمیٹی" کا صدر بھی رہا۔ ۱۹۲۸ء میں اُسے ادبیات کا نوبل پرائز ملا ...... شاید آپ کو یہ سن کر تعجب ہو کہ اسے ادبیات کا نوبل پرائز کیسے مل گیا — بات دراصل یہ ہے کہ برگساں کی فلسفیانہ تحریروں میں ایک ایسا اسلوبِ بیان ملتا ہے جو بہترین ادبی ذوق رکھنے والے ہی کا حصّہ ہو سکتا ہے۔ اسی لئے اس کی تمام کتابیں جہاں اپنے فلسفیانہ موضوع کے لحاظ سے ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں، وہاں وہی کتابیں فرانسیسی زبان کی نثر نگاری کا بہترین نمونہ بھی سمجھی جاتی ہیں۔ اس کے فلسفیانہ اسلوبِ بیان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اُسی طرز کا ہے جس طرز میں دنیا کے بہترین فلسفیوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اگر اس کے اسلوبِ بیان میں ہمیں ایک طرف وہی نرم و نازک مگر معنی خیز تشبیہیں اور استعارے ملتے ہیں جو افلاطون اور برکلے کی فلسفیانہ

تحریروں میں نمایاں نظر آتے ہیں تو دوسری طرف اس کی تحریروں میں وہی ضبط اور اختصار پایا جاتا ہے جو فرانسیسی مفکر کانڈیلاک کی تحریروں کی خصوصیت ہے۔

برگساں کے فلسفے کو ہم فلسفے کی رائج الوقت موضوع وار تقسیم کے ماتحت نہیں لاسکتے کیونکہ جیسا کہ برٹرینڈ رسل نے کہا ہے۔ اس کا فلسفہ فلسفہ کی ہر تقسیم کو قطع کرتا ہے۔ برگساں کو فلسفی کی حیثیت سے ہم فلاسفر کی اُس صنف میں بھی نہیں لاسکتے جنمیں ہمیں ایک طرف تو ہیگل کھڑے نظر آتے ہیں اور دوسری طرف شوپنہاور، سپنسر کیونکہ برگساں نے ان عظیم الشان فلسفیوں کے مانند فلسفہ کا کوئی باقاعدہ نظام مرتب نہیں کیا۔ اُسنے فلسفے میں جو اضافہ کیا ہے وہ صرف حرکت اور زمان و مکان سے متعلق ہے۔ اس کے فلسفے کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس نے بیک وقت کسی مسئلے کے تمام پہلوؤں پر عمومی اظہار خیال نہیں کیا۔ بلکہ اس نے ایک وقت میں ایک ہی مسئلہ کے ایک پہلو کو لیکر اسی پر غور وخوض کیا ہے اور اسی کی موشگافیوں پر اپنا تمام زور استدلال صرف کردیا ہے۔ یہ خصوصیت اس کی تمام کتابوں میں نمایاں نظر آتی ہے اور اسی لئے اس کے فلسفیانہ اظہار خیال میں طرز بیان کی ندرت بھی پیدا ہوگئی ہے۔ جسے ہم اس کا فلسفیانہ طریقہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ جیسا کہ اس نے خود کہا ہے کہ فلسفہ ابہام سے صرف اُسی صورت میں بچ سکتا ہے اور سائنس کی مانند صرف اُسی وقت ترقی کرسکتا ہے کہ عمومی نظریوں اور کلیاتی نظاموں پر زور نہ دیں۔ بلکہ ایک وقت میں صرف ایک خاص مسئلہ ہی پر اپنی توجہ مرکوز کریں۔ کیونکہ ہر مسئلہ کے حل کے لئے ایک خاص نقطۂ نگاہ کی ضرورت پڑتی ہے اور اگر ہم ایک مسئلہ کو حل کرہی لیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس سے دوسرے ملتے جلتے مسائل کا حل بھی نکل آیا ہے!!

برگساں کی ہر کتاب کا ایک ہی مقصد ہے۔ اور وہ یہ کہ ایک ہی مسئلے کی تمام تفاصیل کی وضاحت کی جائے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی ہر کتاب اس کے اصل دفتر فلسفہ کا ایک اہم جز بھی شمار ہوتی ہے۔ جس کا شیرازہ دراصل وقت اور حرکت کی بحث وتحیص کے اجزا پر مشتمل ہے۔

برگساں اُن فلسفیوں میں سے ہے جو اشیاء کی اصل حقیقت جاننے کے لئے صرف وجدان ہی کو صحیح ذریعہ سمجھتے ہیں اور وجدان کی نفسیاتی توجیہہ ہی کی وجہ سے برگساں نے امریکی ماہر نفسیات ولیم جیمز کو بہت متاثر کیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ برگساں کے نظریۂ وجدان پر بہت سے اعتراض بھی ہوئے ہیں اور فلسفے کے بعض نقادوں نے اُسے ذہانت کی نفی کرنے والا ٹھہرایا ہے اور اپنے فلسفے میں صوفیانہ خیالات کی آمیزش کرنے پر مورد الزام گردانا ہے۔ لیکن برگساں کے حامیوں کا خیال ہے کہ جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں وہ برگساں کے فلسفے کی اصل روح اور اس کے اصل جوہر سے اپنی ناواقفیت کا ثبوت دیتے ہیں۔

ویسے تو برگساں نے بہت سی کتابیں اور مضمون لکھے ہیں۔ لیکن اس کی کتاب "زمان اور آزاد مشیّت"، "مادہ اور حافظہ" اور "تخلیقی ارتقاء" بہت مشہور ہیں۔ "زمان اور آزاد مشیّت" میں برگساں نے دورانِ زمانی کی تشریح کی ہے جو اُس کے تمام فلسفے کی بنیاد ہے اس نے زمان کے متعلق اپنا جو نظریہ پیش کیا ہے وہ اُسی ریاضیاتی نظریئے کا فلسفیانہ پہلو ہے جو آئن سٹائن نے "نظریۂ اضافیت" کے عنوان سے پیش کیا تھا اور جس میں اس نے زمان و مکان کو دو علیحدہ علیحدہ حقیقتیں نہیں مانا بلکہ دونوں کو اضافی معانی پہنائے ہیں۔ برگساں کے نزدیک بھی ریاضیاتی وقت محض مکان یا فضا ہی کی ایک شکل ہے۔

اقبال کو برگساں نے دو لحاظ سے متاثر کیا ہے۔ ایک تو اپنے فلسفۂ زمان ومکان کی وجہ سے اور دوسرے اپنے فلسفۂ وجدان کی وجہ سے انیسویں صدی میں سائنس کے نت نئے انکشافات نے کائنات کے مادّی پہلو کو بہت زیادہ اہمیت دے دی تھی اور فلسفے کے دو بڑے سکولوں

"مادیت" اور "مثالیت" میں ایک عجیب کشمکش شروع ہو چکی تھی۔ جس میں "سائنس" مادیت کی پشت پناہ کا کام دے رہی تھی۔ انیسویں صدی کے آغاز میں بعض ریاضی دانوں نے جن میں پلانک اور آئن سٹائن کے نام قابل ذکر ہیں کائنات کا ایک نیا ہی تصور پیش کیا جو کائنات کے اس کلاسیکی تصور کے خلاف تھا جو یونان قدیم کے فلسفیوں سے لے کر گلیلیو اور نیوٹن تک کو صحیح دکھائی دیتا تھا۔ اس نئے تصور نے فلسفہ کے مادیتی سکول کے بعض بنیادی مغالطوں کو دور کیا۔ اور اس طرح "مثالیت" کی مدد کی۔ علامہ اقبال کے دل میں جب الٰہیاتِ اسلام کو فلسفہ اور سائنس کے جدید ترین اصولوں کی روشنی میں نئے سرے سے مرتب کرنے کا خیال آیا تو اس ضمن میں اُن کے سامنے دو تین مشکل مسائل آئے ایک تو یہ تھا کہ جب تک زمان و مکان کے مسئلے کو پوری طرح سو حل نہیں کیا جاتا اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید بے فائدہ ہوگی، کیونکہ ان کے نزدیک مسئلہ زمان و مکان مسلمانوں کے لئے موت اور حیات کا مسئلہ ہے۔ دوسرے انھیں مذہبی تجربے کے وجدان کے معاملے میں وجدان کی ایک ایسی توضیح کی ضرورت تھی جو فلسفے اور سائنس کے اعتبار سے درست ہو۔ اور مضبوط بنیادوں پر استوار ہو۔ ان دونوں مشکل مسائل کی توضیح انھیں برگسان کے فلسفے میں ملی اور غالباً اسی لئے انھوں نے "پیام مشرق" میں پیغام برگسان کے عنوان سے ایک نظم کے ذریعے سے برگسان کو اپنی شاعرانہ عقیدت پیش کی ہے۔

اپنی کتاب "تخلیقی ارتقاء" میں برگسان نے مسئلہ ہست و بود کے تمام پہلوؤں پر بحث کی ہے اور اُسے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب کا موضوع کافی دقیق ہے۔ کیونکہ ... ڈارون کے "مسئلہ ارتقاء" کے فلسفیانہ پہلو کو لیا گیا ہے۔ اور برگسان نے عمل ارتقاء کو ایک ابد بھی مفہوم دیا ہے۔ برگسان نے اس کتاب میں ایسے "وجود" سے بحث کی ہے جو بیک وقت تغیر پذیر بھی ہے اور حرکت بھی ہے۔ برگسان کی یہ کتاب سب سے زیادہ مشہور ہے اور زمانہ حال کے فلسفیانہ تفکر کو بھی سب سے زیادہ اسی نے متاثر کیا ہے اور اسی کتاب میں اُس نے کائنات کے اسرار کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے!!

برگسان کے فلسفے کے متعلق ابھی قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اُس نے زمان و مکان کے متعلق جو خیالات پیش کئے ہیں۔ اُن کی صداقت اس وقت تک تو مسلم رہے گی جب تک نظریہ اضافیت کی صحت پر کوئی شک نہیں کیا جاتا۔ مگر اُس کے نظریۂ وجدان کی صداقت اُس وقت تک مسلم نہیں ہو سکتی جب تک جدید نفسیات کی طرف سے مذہبی تجربات اور تصوف کا کوئی خاطر خواہ سائنٹیفک جواز پیش نہ ہو جائے!!

مختار علی ایڈووکیٹ

گستاخ جذبہ

پروفیسر نکلسلے نے کہا ——— میں اپنا فیصلہ بدلنے کے لئے تیار نہیں ———
یہ لمحات اس کی زندگی کے آخری لمحات سہی ——— مگر ——— میں اس سے
شادی کر دوں گا ——— یہ میرا آخری فیصلہ ہے ———

ناقابلِ تسخیر جذبہ

[illegible] جذبہ ہے جو ہمارے تمام جذبات پر غالب رہتا ہے۔ اس جذبے کے مقابل ہر جذبہ مثلاً خواہش دولت، شہرت پسندی، رشتہ شناسی، غیرت، شرم وغیرہ ہر جذبہ بکر ور ثابت ہوتا ہے۔ میری مراد جذبۂ جنس سے ہے۔ جس کی قوت اور ہمہ گیری بلاشبہ ناقابلِ یقین ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ انسان کی تمام کیفیتیں، خواہشیں، سوچنے کا انداز، رہن سہن کا طریقہ، کھانے پینے کے آداب ہر دور میں بدلتے رہتے ہیں اور آج قرون قدیم زمانے کے مقابلے میں انقلابی تبدیلیاں رونما ہو گئی ہیں، لیکن جنسی جذبے کے آگے انسان ہمیشہ سپر انداختہ رہا ہے اور اس میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو انسان آج بھی وہی ہے جو آج سے ہزاروں سال پہلے تھا۔ ہمارے دوسرے جذبات مثلاً رحم، غم و مسرت، ظلم، خود نمائی وغیرہ کی نوعیت جذبۂ جنسی سے بڑی حد تک مختلف ہے۔ یہ جذبات ہمارے دل میں کسی خارجی سبب کے بغیر پیدا نہیں ہوتے۔ ان کا ظہور یا ان کی پیدائش ہمیشہ کسی خارجی اور بیرونی محرک کی محتاج ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر رحم کا جذبہ اس وقت پیدا ہوتا ہے۔ جب ہم کسی شخص کو اذیت کا شکار اور امداد کا طالب پاتے ہیں۔ ہمیں غصہ اس وقت آتا ہے جب ہمارے سامنے کوئی اشتعال انگیز واقعہ پیش آئے۔ مگر اس کے برخلاف جنسی جذبے کی نوعیت اور کیفیت بالکل جداگانہ ہے۔ یہ جذبہ کسی خارجی سبب کا محتاج نہیں۔ بھوک، پیاس اور نیند بھی اسی زمرہ میں آتی ہے۔ ان جذبات کو نفسیات کی اصطلاح میں اشتہا (Appetite) کہا جاتا ہے کوئی بھی جاندار اس اشتہا سے آزاد نہیں رہ سکتا۔ ممکن ہے کہ کوئی شخص عمر بھر رحم اور غیظ و غضب کے جذبے سے عاری رہا ہو لیکن ایسے فرد کا وجود ممکن نہیں جس نے اپنی زندگی میں کھانے کی ضرورت محسوس نہ کی ہو یا اپنے اندر جسمانی ملاپ کی خواہش نہ پائی ہو۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ خواہشیں ہمارے عام جذبات سے کہیں زیادہ اہم اور طاقتور ہیں۔ ان کے بغیر زندگی کا تصور ہی ممکن نہیں۔

مل اور محبت

جذبہ ایسا بے ادب، گستاخ اور جابر و قاہر جذبہ ہے جو بڑے بڑے زاہدوں اور خشک مزاج اور نفس کش انسانوں کو بھی آسانی سے اپنا محکوم بنا لیتا ہے۔ ہمارے سامنے تاریخ کی ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں کہ لوگوں نے اپنے تمام جذبات کو کچل کر اس جذبے کی تسکین کو اپنا مقصدِ منتہا تصور کر لیا۔ انگلستان کے ممتاز ترین مفکرین میں جے۔ ایس۔ مل (J. S. Mill) جذبات کشی کے لحاظ سے ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ وہ انتہائی سنجیدہ اور خشک مزاج آدمی تھا۔ اس کی طبیعت میں لطافت اور شوخی و ظرافت کا شائبہ بھی نہ تھا۔ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ بچپن سے لے کر بڑھاپے تک صرف ایک دفعہ ہنسا تھا۔ لیکن یہی مفکر جس نے نفس کشی کو اپنا شعار بنا لیا تھا، جنسی جذبے کے مقابلے میں بری طرح ہار گیا۔ اس سلسلے میں اس کے ساتھ جو

واقعہ بھی یاد رکھئے ۱۸۳۰ء میں اس کی ملاقات ایک شادی شدہ خاتون مسز ٹیلر سے ہوئی۔ مسز ٹیلر بہت ہی حسین خاتون تھی۔ ملاقاتوں کا سلسلہ کچھ دن تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ ان ملاقاتوں نے باقاعدہ محبت کی شکل اختیار کر لی اور محبت بھی اتنی شدید کہ اس خاتون کے بغیر مل کے لئے ایک لمحہ گذارنا بھی دشوار ہوگیا۔ اب سنئے کہ مسٹر ٹیلر کو اس واقعہ کا علم ہوتا ہے۔ وہ انتہائی کوشش کے باوجود اپنی بیوی اور مل کے تعلقات ختم کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ اور آخر کار اسے پیرس بھیج دیتے ہیں۔ مل جیسے خشک عالم اور فکر پرست مفکر کے جذبات اس عورت کے لئے اتنے شدید ہیں کہ وہ انگلستان چھوڑ کر پیرس کا سفر اختیار کرتا ہے۔ مل کی اس دیوانگی کا علم اس کے والد کو بھی ہوتا ہے۔ اور اسے مجبوراً مل جیسے عالم اور مفکر بیٹے کو ڈانٹنا پڑتا ہے۔ ذرا سوچئے تو سہی کہ مل جیسے آدمی کو محبت کے قصور پر ڈانٹا جا رہا ہے۔ مل اور محبت! چنانچہ اس واقعہ کی اطلاع انگلستان کے گوشے گوشے میں پہنچ گئی۔ اب یہ واقعہ ہزاروں افراد کی گفتگو کا موضوع تھا۔ دوست مجبور ہوئے کہ اپنے عالم دوست کو سمجھائیں اور عجز ناز ادادوں سے باز رکھیں۔ مگر مل نے کسی کی نہیں سنی۔ اس نے طے کر لیا کہ وہ اپنی محبوبہ کی خاطر ساری دنیا کو چھوڑ دے گا۔ اس نے کہا کہ میں اس سلسلے میں ایک حرف سننے کے لئے تیار نہیں۔ جدید منطق کے اس بانی سے لوگ بحث تو کر نہیں سکتے تھے انھیں جرأت بھی نہیں ہوسکتی تھی۔ چنانچہ سمجھانے والے مجبور ہوکر خاموش ہوگئے۔ اسی زمانے میں اچانک مسٹر ٹیلر کا انتقال ہوگیا۔ وہی سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ چنانچہ ان کی موت کے دوسرے ہی دن ان کی بیوہ لباس عروسی پہنے ہوئے نظر آئیں۔ اب وہ مسز مل تھیں۔

ہکسلے جیسا خشک مفکر اور ....!

اس ظالم اور ستم ظریف جذبہ کا ایک اور کرشمہ ملاحظہ کیجئے۔ یہ واقعہ پروفیسر ہکسلے جیسے کھردرے، بدمذاق خشک طبیعت سائنسداں سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی زندگی میں ایک خاتون داخل ہوتی ہے اور اس کے ہوش و حواس پر مسلط ہو جاتی ہے۔ ہکسلے اس سے ازدواجی تعلق قائم کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ مگر بدقسمتی سے وہ خاتون بیمار تھی اور مرض دق میں مبتلا بھی تھی، اس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ زیادہ دن دق کا مقابلہ کر سکے۔ آخر فلسفی نے ایک ماہر ڈاکٹر سے اپنی محبوبہ کا معائنہ کرایا۔ ڈاکٹر کا فیصلہ تھا کہ مریضہ چھ ماہ سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ ہکسلے خود بھی ڈاکٹر تھا اور سب کچھ جانتا تھا مگر اس کے باوجود وہ یہ بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوا۔ اس نے کہا کہ ڈاکٹر اگر اس کی زندگی میں ایک ایک گھنٹہ بھی باقی ہے تب بھی میں شادی کرنے کے فیصلے پر نظرثانی کرنے کے لئے تیار نہیں۔ یہ لمحات اس کی زندگی کے آخری لمحات ہی سہی۔ مگر میں اس سے شادی کروں گا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔

فرائڈ کہتا ہے

بے شک محبت، محبت کیا جنسی خواہش ہی کہئے۔ اتنی شدید خواہش ہے جو ہمارے عقل و ہوش پر بری طرح حکومت کرتی ہے۔ کیا مجال کہ انسان اس کے حکم سے انحراف کر سکے۔ اور انسان میں کسی کی تخصیص نہیں۔ تمام انسان بلاتخصیص اس کے محکوم اور غلام ہیں۔ اس کا پیدا یا فنا کرنا ہماری قدرت سے باہر ہے۔ انسان روز پیدائش سے لے کر یوم وفات تک اس کا بندہ بے دام رہتا ہے۔ ہمارے تمام اعمال، اقوال اور حرکات میں اس کی جھلک نظر آتی ہے۔ یہ سلسلہ عالم بیداری ہی نہیں عالم خواب میں بھی جاری رہتا ہے۔ ہمارے بیشمار خواب اس جذبہ کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ فرائڈ کہتا ہے کہ مردوں اور عورتوں کے خوابوں کا بہت ہی عمیق مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کی بنیاد (Erotic) خواہشات ہیں۔ ہمیں اپنے بیشتر خواب بظاہر سادہ اور جنسی جذبے سے بالکل بے تعلق معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ان کے تجزیہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کا سبب پوشیدہ یا ناآسودہ جنسی خواہشات ہیں۔ ان خوابوں کو ان بچوں کی حرکات سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جو ہمیں نہایت سادہ، معصوم اور جنسی جذبے سے یکسر پاک معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ان کے اندر جنس کی لہر دوڑتی رہتی ہے۔ بالغ مرد اور عورتوں کے خواب بھی اس لئے سادہ نظر آتے ہیں کہ جنسی خواہشیں ان میں علامتوں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں۔ ان علامات کا مطالعہ فرائڈ کے زمانے سے ماہرین نفسیات کے لئے بڑا دلچسپ موضوع رہا ہے۔ اکثر ہوتا یہ ہے کہ جنسی خواہشیں ان علامات کی شکل میں نمودار ہوتی ہیں جن کی حقیقت اور معنویت

سے ہم خود باخبر نہیں ہوتے۔ پرانے زمانے میں لوگوں کا خوابوں کی تعبیر پیش کرنا ان علامات کے مطالعے ہی پر مبنی تھا۔ ہم خوابوں میں جنسی علامتوں کی چند مثالیں پیش کرتے ہیں۔

خوابیں اور تعبیریں

ایک خاتون کہتی ہے کہ :۔

"میں نے خواب میں دیکھا کہ لال ٹوپی پہنے ہوئے ایک شخص ایک گلی میں میرا تعاقب کر رہا ہے۔ میں اس سے بھاگ کر زینہ پر چڑھ گئی اس شخص نے زینہ پر بھی میرا تعاقب جاری رکھا۔ زینہ پر چڑھتے ہوئے میرا سانس پھولنے لگا۔ اوپر پہنچ کر میں کمرے میں داخل ہو گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ تعاقب کرنے والا کمرے کے باہر رہ گیا۔ میں نے دروازے کے سوراخوں سے جھانک کر دیکھا کہ وہ شخص ایک کرسی پر بیٹھا رو رہا ہے"

واقعہ یہ تھا کہ جس رات اس نے یہ خواب دیکھا اس رات وہ اپنے محبوب سے تنہائی میں ملی تھی، چونکہ وہ ابھی دوشیزہ تھی اس لئے اس نے اور اس کے محبوب نے بچے کی پیدائش کا امکان ختم کرنے کے لئے کچھ احتیاطی تدابیر اختیار کی تھیں۔

اب فرائڈ سے اس خواب کی روشنی میں خواب کی تشریح سنئے۔ وہ کہتا ہے کہ عورت کا لال ٹوپی والے مرد کے ساتھ زینہ پر چڑھنا ۔ جنسی فعل ۔۔۔۔۔ کی علامت ہے۔ زینہ کو جنسی عمل کی علامت (Symbol) خیال کیا جاتا ہے۔ مرد کا کمرے سے باہر رہ جانا جنسی فعل کے نامکمل رہنے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جنسی جذبے کے نامکمل رہنے سے اس دوشیزہ کا مادرانہ جذبہ فطری طور پر آزردہ ہوا ہوگا چنانچہ خواب میں لال ٹوپی والے شخص کو روتے ہوئے دیکھنا اس کے مادرانہ جذبے اور آزردگی کو ظاہر کرتا ہے۔

اسی طرح ایک مرد اپنا خواب بیان کرتا ہے۔

"میں نے دیکھا کہ میری بہن دو سہیلیوں کے ساتھ آرہی ہے، تینوں میرے قریب آگئیں میں نے ان دو لڑکیوں سے ہاتھ ملایا لیکن بہن سے نہیں"

اس شخص نے فرائڈ سے اپنے خواب کی تعبیر معلوم کی، فرائڈ نے اس کی گذشتہ زندگی کے حالات اور اس کے خیالات معلوم کرنے کے لئے متعدد سوالات کئے لیکن اس شخص نے کوئی ایسا واقعہ نہ بتایا جو اس خواب سے تعلق رکھتا ہو۔ البتہ آخر میں اس نے کہا کہ بہت دنوں کی بات ہے کہ میرے ذہن میں ایک عجیب سا سوال پیدا ہوا۔ وہ سوال یہ تھا کہ لڑکیوں کے پستانوں کو فطری شکل اختیار کرنے میں اتنی مدت کیوں درکار ہوتی ہے؟ یہ سوال میرے ذہن میں اپنی بہن کے جسم کو دیکھ کر پیدا ہوا تھا۔ اگر یہ سوال کسی اور لڑکی کے جسم کو دیکھ کر پیدا ہوا ہوتا تو میں اس کے پستانوں کا امتحان کرنے پر مجبور ہو جاتا۔ فرائڈ نے کہا کہ۔ تم نے خواب میں جن لڑکیوں کو دیکھا وہ پستانوں کی علامت (Symbols) ہیں اور انہیں چھونے کا خیال ان لڑکیوں سے ہاتھ ملانے کی صورت میں ظاہر ہوا۔

یہ مثالیں واضح کرتی ہیں کہ جنسی جذبہ کتنا پیچیدہ ہمہ گیر اور قوی جذبہ ہے۔ یہاں تک کہ ہمارے خوابوں پر بھی اس کی حکومت ہے۔ سوچنے اور سمجھنے والے ذہنوں میں اس گفتگو کے بعد جو سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے اخلاقی اصول اور ہماری مقدس قدریں جن کا پور از ور جنسی جذبے کو کچلنے میں صرف ہوتا ہے، ان حقائق کے بعد اپنا کیا جواز پیش کریں گے کبھی یہ سوچا ہے کہ اگر یہ اخلاقی اصول نیست و نابود کر دئے جائیں تو پھر جنسی اخلاق کی نئی قدریں کیا ہوں گی۔ آج جبکہ اخلاق کی پرانی قدریں اپنی قوت کھو چکی ہیں تو یہی سوال ہمیں بار بار اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔

سید محمد تقی

حشر کا میدان

حشر کا میدان ——— ! جی ہاں حشر کا میدان اور یوم حساب ——— !
میں نے دونوں کے مناظر دیکھے ہیں۔ اور وہ بھی خواب میں نہیں۔ بلکہ عربی انداز بیان کے مطابق "اپنے سر کی ان دونوں آنکھوں سے۔"

یہ حسین پریوں کے وطن ——— وینس ——— کا ذکر ہے جہاں کوئی ڈیڑھ ہزار سال پرانی ایک عمارت ہے۔ جو ٹوٹے پھوٹے کھنڈروں کے بیچوں بیچ ماضی کی مری ہوئی یادگاروں کو اپنے دامن میں چھپائے ——— وینس ——— سے کوئی پچیس میل کے فاصلے پر ایک دور افتادہ گاؤں میں واقع ہے۔ اس عمارت میں ماضی کے دھندلے تصویری نقوش مدہم رنگوں میں چند عظیم مصوروں کی حسن کاری کے نمونے پیش کر رہے ہیں۔

احاطے کی کوئی پچاس گز بلند دیواروں پر تصویروں کے یہ نمونے جن میں میدان حشر اور یوم حساب کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ تصویر پرستی کی اس تحریک کا ورثہ ہیں جو ——— متھرائیت ——— نے عیسائیت کے لئے چھوڑا تھا۔ پندرہ گز چوڑی اور پچاس گز اونچی اس دیوار پر اوپر سے نیچے تک آڑھی ترچھی بہت سی تصویریں بنائی گئی تھیں۔

خدا

عیسیٰ

اور مریم ——— تینوں کی تصویریں تھیں جو اُن بہت سے آڑھے ترچھے مگر ڈراؤنے نقوش میں ابھری ہوئی تھیں۔ جن میں سے بعض جنت میں اور کئی جہنم میں گرتے نظر آ رہے تھے۔ یہ منظر اُن لوگوں کے لئے حیرت انگیز ——— بالکل ہی ناقابل قیاس تھا ——— جو خدا کو جسم و جسمانیت سے ماورا سمجھتے ہیں ——— لیکن ان ممالک میں جہاں دو ہزار سالہ عیسائیت کا ۱۷ سو سالہ اقتدار رہا ہے۔ یہ مناظر بہت سوں کے لئے ایک محض روزمرہ کی سی بات ہے جو ——— کچھ یونہی ہوا کرتی ہے اور یونہی ہونا بھی چاہئے۔

ہر چند کہ ایک قابل ذکر حصے نے ابتداہی میں اس رجحان کے خلاف احتجاج کیا تھا اور پھر عہد اصلاح میں تو یہ احتجاج ایک باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کر گیا تاہم مذہبی جذبے کی فنی نمود سے یورپ میں فنون لطیفہ کا جو تاریخی دور آیا اس کے دلکش اور حیرت انگیز نمونے یورپی ممالک خاص طور پر ان علاقوں میں جہاں کیتھولک عیسائیت کا اقتدار ہے جابجا نظر آتے ہیں۔ اٹلی جو کیتھولک عیسائیت کا مرکز اور پاپائے رومتہ الکبریٰ کا وطن ہے اس اعتبار سے دنیا کے ہر ملک سے زیادہ خوش قسمت ہے۔

روم اپنی مجسمہ تراشی، نقاشی اور مصوری کے حیرت انگیز شاہکاروں اور آرٹ کے دیدہ زیب نمونوں کے اعتبار سے فنون لطیفہ کا سب سے بڑا منبع اور تاریخی لحاظ سے آرٹ کے ایک عجائب گھر کی حیثیت رکھتا ہے۔ روم کو یونان - مصر اور مغربی ایشیائی تہذیبوں اور تمدنوں کا طاقت ور ورثہ ملا ہے۔ جس کے فن بداماں نشانات آپ کو جمہوری روم کے کھنڈروں سے لیکر —— شاہی روما الکبریٰ —— کے محلوں۔ پارکوں۔ خانقاہوں عبادتگاہوں اور درس گاہوں کی شکستہ، نیم شکستہ اور صحیح و سالم عمارتوں میں جا بجا بکھرے ہوئے نظر آئیں گے۔ آگسٹس کی عظیم سلطنت کے ہی نہیں، آرٹ کے سب راستے بھی واقعی صرف روم ہی جاتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ دوسرے شہر ایک دن میں بن سکتے ہوں یا نہ بن سکتے ہوں مگر —— روم —— ایک دن میں لازماً نہیں بن سکتا۔ مکاشفہ کے مصنف نے عظیم شہر بابل کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ —— عظیم بابل —— وہ کیسی ہے ——

جو توہین و تعذیب۔ کے خیال سے بہت دور کھڑی ہوئی یہ کہہ رہی ہے کہ —— افسوس ——
صد افسوس —— اس عظیم شہر بابل —— اس باشکوہ شہر پر —— ! اس لئے کہ
ایک ہی گھنٹہ میں تیری قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے۔ اور زمین کے تاجر اس کا ماتم کریں گے ——
اس پر روئیں گے اس لئے کہ اب کوئی بھی شخص اشیائے تجارت نہ خریدے گا . . . . ——

یہ عظیم کبھی مہذب دنیا کا سب سے بڑا مرکز بنی ہوئی تھی اور چار دانگ عالم سے سارے قافلے اسی کی طرف آتے تھے۔ بابل کے بعد اگر کوئی مقام تھا تو روم تھا اور اس لئے یہ قول بابل پر اتنا صادق آتا ہو یا نہ آتا ہو لیکن روم پر اس کا اطلاق پوری طرح ہوتا ہے جو یونان کے توسط سے قدیم تمدنوں کے ورثہ کو عہد جدید تک پہونچانے کا تاریخی کارنامہ انجام دے چکا ہے۔

روم کی تاریخ جو لگ بھگ ۲۷ سو سال پر پھیلی ہوئی ہے۔ جمہوری اور شاہی دور میں منقسم ہے۔ سیزر سے پہلے وہ دور تھا جو عظیم جمہوری دور سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس دور کے کھنڈر مسولینی کی کوششوں سے دریافت کئے جا چکے ہیں۔ اس جمہوری دور کی اہم یادگار کیپٹول کی عمارت تھی جس کے ٹوٹے ہوئے ستونوں کے سائے میں ایڈورڈ گبن نے اپنی مایۂ ناز تاریخ "زوال سلطنت روما" لکھنی شروع کی تھی۔ کیپٹول کے باشکوہ کھنڈروں سے لیکر سینٹ پیٹرس کے گرجا تک، روم کے آرٹ اور فن کے یادگار نمونے ملتے ہیں سینٹ پیٹر کا گرجا دنیا کا سب سے بڑا گرجا خیال کیا جاتا ہے۔ جس کا گنبد ساری دنیا میں اپنی وسعت کے اعتبار سے کوئی جواب نہیں رکھتا۔ اس گرجا میں مشہور فنکار میکائیل انجیلو کی نقاشی اور مجسمہ تراشی کے زندہ جاوید نمونے ملتے ہیں۔ اس گرجا میں میکائیل انجیلو نے "موزے اک" طرز نقش سازی کا ایک عجیب اور ناقابل مثال کارنامہ پیش کیا ہے —— "موزے اک" آرٹ میں پتھر۔ شیشے اور رنگین اشیاء کے مجموعے سے عمارت کے کسی حصے کو مزین کیا جاتا ہے۔ یہ کام بیحد دقت طلب ہے اور سخت باریک بینی احتیاط اور توازن کا متقاضی ہوتا ہے۔ میکائیل انجلو نے اس آرٹ کو اپنی تکمیلی شکل میں پہونچا دیا ہے اس نے عمارت کے کسی چھوٹے حصے کو نہیں بلکہ پورے کے پورے مجسمے کو "موزے اک" طرز پر بنایا ہے۔ جسم کے مختلف حصوں کے توازن کو ان گنت ٹکڑوں کے امتزاج سے پیدا کرنا ایک تقریباً ناممکن سی کوشش تھی جو آرٹ کی دنیا میں کبھی بھی نہ کی جا سکی تھی لیکن مائیکل انجلو نے اس تاریخی کارنامے کو حیرت انگیز طور پر انجام دیکر فن کی تاریخ میں ایک بے مثال سنگ میل قائم کر دیا ہے۔

مشہور فنکار ٹیٹین کے بارے میں ایک فرانسیسی نقاد نے کہا ہے کہ —— "اس نے اپنے پیشروؤں کی ذہانتوں کو اپنی ذات میں جذب کر لیا تھا اور اپنے بعد آنے والوں کو تباہ کر ڈالا —— میکائیل انجلو نے نہ ماضی کے کسی شخص کو اپنی ذات میں جذب کیا اور نہ مستقبل کے کسی شخص کو تباہ اس لئے کہ انہوں نے جو کارنامہ انجام دیا بلاشبہ نہ اس کے پیشرو اسے انجام دے سکے اور نہ بعد میں آنے والے ——

برنارڈ شا نے "جان بل کے دوسرے جزیرے میں" — میں ایک دیوانے پادری کی زبانی دنیا کی مثالی حالت کا تصور جن الفاظ میں تسلیم کرایا ہے۔ آپ ذرا اُسے اس پادری کی زبانی سنئے۔ پادری کہتا ہے۔

"میرے خیال میں وہ (مثالی دنیا) ایک ایسے ملک سے عبارت ہے جہیں ریاست کلیسا ہوتی ہے ، اور کلیسا عوام ہوتے ہیں۔ تین ایک میں جمع ہوتے ہیں اور ایک تین میں۔ وہ ایک دولت مشترکہ ہوتی ہے جس میں کام کھیل ہوتا ہے اور کھیل کام۔ تین ایک میں اور ایک تین میں۔ وہ ایک گرجا ہوتی ہے جس میں پادری، عبادت گزار اور عبادت گزار معبود ہوتا ہے۔ تین ایک میں اور ایک تین میں — جو ایک دیوتا ہوتا ہے ، جس میں حیات انسانی ہوتی ہے۔ انسانیت : الوہی تین ایک میں اور ایک تین میں —

برنارڈ شا کے خیال میں یہ دنیا محض ایک دیوانہ کا خواب ہے لیکن — تین ایک میں اور ایک تین میں — والے اس دیوانے کے خواب کی اگر کوئی تعبیر کہیں مل سکتی ہے تو وہ آرٹ کے تین شاہکار ہیں جو میکائیل انجلو نے پیش کئے ہیں اور جن کے نام یہ ہیں —

یوم حساب — حضرت موسیٰ کا سنگین مجسمہ — اور — سینٹ پیٹر کے گرجے کا گنبد —" آرٹ کے یہ تینوں نمونے بیک وقت ایک اکائی ہونے کے باوجود اپنی جگہ تین مستقل شاہکار بھی ہیں اور ایسے کہ فن کے ان نمونوں کے جرمن نقادوں کو بھی یہ تسلیم کرنا پڑا کہ یہ اپنے بعد کے شاہکاروں سے کہیں بہتر ہیں اور ان کی حقیقت پسندی کی بعد کے ماہرین کامیاب نقالی نہ کر سکے۔ سینٹ پیٹر کا گرجا دنیائے عیسائیت کا سب سے بڑا مرکزی گرجا ہے۔ یہ پانچسو فیٹ اونچا اور ۲۰۵ گز لمبا ہے۔ سینٹ پیٹر کا یہ گرجا ویٹیکن کی وسیع ترین عمارت کا حصہ ہے۔ یہ عمارتیں کئی حصوں پر مشتمل ہیں جن میں — پردبینو — لیوکا سگنوریلی — بوٹی سیلی — گھرلان ڈاجو — میکائیل انجلو اور دوسرے متعدد فنکاروں نے اپنے فن کے شاہکار نمونے پیش کئے ہیں۔ نقاشی کے یہ کارنامے ویٹیکن کی عمارتوں کو آرٹ کا بہترین میوزیم بنانے کا باعث بن گئے ہیں۔

محمد مہدی

دیکھنا بھی گناہ ہے

شہنشاہ کے چہرے کو دیکھنا گناہ ہے ——— ایک مرتبہ بحری بیڑے
کے افسر اعلیٰ کی نظر شہنشاہ پر پڑ گئی۔ اُس نے کیا کیا ؟ ——— اپنی
کنپٹی میں گولی مارلی ———

دن کا وقت ——— دس بجکر دس منٹ !

۲۹ راپریل کی ایک چمکیلی صبح اور سن انیس سو ایک عیسوی۔ بیسوی صدی کا پہلا سال !

ٹوکیو کے امپریل پیلس میں ایک سو چوبیسواں[۱۲۴] خدا پیدا ہوا۔ دو ہزار چھ سو بتیس سال سے برابر (آسمان سے نہیں) آفتاب سے خدا نازل ہوتے رہتے ہیں۔ وہ سورج کے بیٹے ہیں۔ سورج کی کرنوں کے ساتھ زمینوں پر نازل ہوا کرتے ہیں[۱]۔ اس خدا کا نام ہے "ہی رُو ہی تو" (HIROHITO) یا ہیرو ہیٹو دونوں لفظوں کے معنی ہیں۔ رفیع المرتبت انسان۔ عالی شان وجود ۔ بلند رتبہ ہستی !

کوئی شخص اپنا نام "خدائے عزوجل" نہیں رکھ سکتا اور نہ ہیرو ہیٹو ——— جزائر جاپان میں ۸ کروڑ انسان بستے ہیں۔ ان میں کسی کا نام ہیرو ہیٹو نہیں۔ قانونی بندش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ جاپان جمہوری مملکت ہے ۔ خیر البتہ آداب بندگی ضرور حائل ہیں۔ پچھلے ساٹھ سال میں صرف ایک حادثہ پیش آیا تھا۔ ہوا یہ کہ شمالی جاپان کے کسی دور افتادہ ضلع میں ایک کاشتکار کے اپنے بیٹے کا نام "ہیرو ہیٹو" رکھ لیا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ یہ نور دیدۂ قدرت اور آرام جان مشیت یعنی ——— فرزند اکبر آفتاب شہنشاہ جاپان ——— کا نام ہے تو اس نے اپنے پورے خاندان کو معہ نومولود کے قتل کر ڈالا اور خود ہارا کری[۲] (خودکشی) کرلی۔

شاہوں کے شاہ۔ ہیرو ہیٹو ——— نے اپنے عہد حکومت کا نام (قدیم رسم کے مطابق) شووا (SHWA) یا "امن درخشاں" تجویز کیا ہے ——— جاپان کے سن شہنشاہی (مغلیہ اصطلاح میں سال جلوس) کا نام بھی "امن درخشاں" ہی ہے۔ اور جس وقت آپ یہ سطر پڑھ رہے ہیں۔ جاپان ۳۶ شووا[۳] سے گزر رہا ہے۔

---

[۱] راجپوتوں کے سورج بنسی گھرانے کی امتی روایات بھی پیش نظر رکھیے۔

[۲] KARA KIRI (خودکشی) جاپان میں صرف اتنی اہمیت رکھتی ہے جس طرح ہمارے یہاں الگاؤں پر چلنے کی رسم۔

[۳] RADIANTPEAC کے شہنشاہ ہیرو ہیٹو ۱۹۲۸ء میں تخت نشین ہوئے تھے۔

یہ بات بہت شاذ ہے کہ جاپان میں کوئی شخص شہنشاہ کا نام زبان پر لاسکے جب وہ ذاتِ ہمایونی کی طرف اشارہ کرنا چاہے گا تو کہے گا ــــ "ٹن نوہی کا" (TENNOHEIKA) یعنی ـ عالم پناہ ـ شاہوں کے شاہ یا پھر ـ ٹن شی ساما (TENSHISAMA) یا ـ ابن اللہ ـ خدا کا بیٹا ـ جاپان میں شاہی خداوندوں کی پرستش ہر حال میں ہوتی ہے ـ زندہ ہیں تو ـ خدا کے بیٹے اور مر گئے تو ..... ؟ دیوتاؤں میں سے ایک![1]

ملوکیت اور شاہی نے اپنے لئے چند استعارے چن لئے ہیں ـ زار ـ قیصر ـ خدیو ـ کسریٰ ـ خاقان وغیرہ ـ مثلاً زار روس ـ قیصر روم ـ خدیو مصر یا کاسو عجم خاقان چین ـ اسی لغتِ شاہی میں "می کاڈو"[2] بھی شامل ہے ـ سوائے جاپان کے دنیا کے ہر ملک میں شہنشاہِ جاپان کو "می کاڈو" کہا جاتا ہے ـ جس کے معنی ہیں "بابُ العرش" یا الوہیت کا دروازہ! ـــ مگر یہ باہر والوں کا طریقہ ہے ـ ٹکسالی جاپانی کبھی شہنشاہ کو "می کاڈو" نہ کہے گا ـ شہنشاہ ـ کبھی کاغذات پر دستخط نہیں کرتا ـ (دیوتا قلم کیوں پکڑیں) وہ صرف اپنی مہر ثبت کرتا ہے اور وہ پرچہ کاغذ آسمانی دستاویز بن جاتا ہے ـ جب سرکاری گزٹ میں کوئی شاہی فرمان چھپتا ہے تو دستخط کی جگہ عبارت سے اوپر چھپا ہوا ہوتا ہے "اسم معلی" (نام مبارک بادشاہ) ـ البتہ جب شہنشاہ غیر ملکوں کو پروانۂ خوشنودی عطا کرتا ہے تو کبھی کبھی اپنے دستخط انگریزی میں کر دیا کرتا ہے ـ

۶۶۰ ق ـ م سے ۱۹۶۰ء تک

دو ہزار چھ سو بیس سال سے مسلسل میروہیٹو کا خاندان شہنشاہی اور خدائی کرتا چلا آ رہا ہے ـ ۱۸۶۷ء تک جاپان کے شہنشاہ پس پردہ رہے اور ان کے نام پر دیا نام سے شوگن[3] حکمرانی کرتے رہے ـ ۱۸۶۷ء میں "مت شوہی تو" نامی شہنشاہ نے اپنے کو شوگنوں کے اثرات سے آزاد کر لیا اور (MEIJI) می جی کے لقب سے ۱۹۱۲ء تک (۴۴ سال) حکومت کی ـ ۱۹۱۲ء میں می جی کے ولی عہد "یوشی ہی تو" مسند آرائے حکومت ہوئے ـ لیکن دماغی توازن کے مختل ہو جانے کے سبب ۱۹۲۱ء میں اپنے ولی عہد (موجودہ شہنشاہ) کو نائب مطلق بنا دیا ـ جو ان کی وفات پر ۱۹۲۶ء میں جاپان کے حکمران قرار پائے ـ لیکن اگر کوئی جاپان میں ــ سابق شہنشاہ یوشی ہی تو "کو دیوانہ" کہہ دے (حالانکہ سب جانتے ہیں کہ ان کا دماغ چل گیا تھا) تو اسے سزائے موت دے دی جائے ــ خداوند اور پاگل ــ؟

شہنشاہ آج کل ٹوکیو کے بیچوں بیچ (KYU نامی) محل میں زندگی بسر کرتے ہیں ـ یہ دنیا کی سب سے زیادہ قابلِ دید عمارتوں میں سے ایک ہے ــ ۱۸۶۸ء سے قبل اس قلعہ نما محل میں "شوگن" رہائش پذیر تھے ـ لیکن ۱۸۶۸ء سے شاہی خاندان اس عمارت میں منتقل ہو گیا ہے ـ اس محل کے گرد باغ ہی باغ اور ایک ہلالی دیوار ہے ـ جس میں چالیس دروازے اور دیدبان (کمانڈنگ ٹاور) مینار بنے ہیں ـ یہ دیوار "زلزلہ پروف" ہے[4] ـ محل کے اندر متعدد سبزہ زار ــ محلات ـ حویلیاں ـ حوضیں ـ اور شاہی تزک واحتشام رکھنے والے دوسرے دیوان خانے ہیں ـ محل میں بجز خاص خاص لوگوں کے کسی کو قدم رکھنے کی اجازت نہیں شہنشاہ (گویا) سات پردوں کے اندر عظمت وجبروت کی پراسرار زندگی بسر کرتے ہیں ـ موسم گرما میں شہنشاہ ٹوکیو سے ـ تیس میل دور ـ ہیاما[5] (HAYAMA) کے محل میں چلے جاتے ہیں ـ جہاں انہوں نے غسل و تفریح کے لئے ایک خوبصورت جھیل تعمیر کرائی ہے ـ شہنشاہ بذاتِ خود بہترین "شناور" (SWIMMER) واقع ہوئے ہیں ـ اس محل میں شہنشاہ نے دریائی مخلوقات کے بہترین نمونے جمع کر رکھے ہیں ـ کیونکہ انہیں ـ بحری حیاتیات[6] کے علم سے بطورِ خاص دلچسپی ہے ـ ان محلات کے علاوہ جاپان بھر میں شہنشاہ کے پچاس محل اور ہیں ـ لیکن وہ کبھی شاید ہی ان میں گئے ہوں ـ ڈھائی ہزار سال سے جاپانی شہنشاہوں نے شاہی کا اُبار

---

[1] تاریخ جاپان [2] MIKADO ـ جاپان انسائیکلو پیڈیا ـ جلد اول (ٹوکیو)

[3] SHOGUNS ـ یا وکیل مطلق (تاریخ جاپان ـ ایک مشرقی مملکت ـ مطبوعہ امریکہ)

[4] جاپان میں ـ ازجہان گیر (دار ایڈیشن)

[5] KAMAKURA ـ نامی شہر کے قریب

[6] MARINEBIOLOGY

انجام دینے کے لیے کچھ ضابطے بنا رکھے ہیں۔ ہیرو ہیٹو انھیں ضابطوں کی پابندی کرتے ہیں۔ ہر سال اکیس[۲] مرتبہ بزرگوں کی پوجا کی رسم ادا کی جاتی ہے[۱]۔ سال میں ایک مرتبہ یاسوکونی کے مندر میں جا کر شہنشاہ جاپان کے جنگی سورماؤں کی رسم پرستش میں شرکت کرتے ہیں۔ ہر سال فوج اور بحری بیڑے کی سالانہ تقریب میں شریک ہوتے ہیں۔ جاپانی پارلیمنٹ (DIET) کا افتتاح کرتے ہیں۔ بیرونی سفراء کی اسناد سفارت منظور کرتے ہیں۔ اور کبھی کبھی ممتاز ترین مہمانوں سے ملاقات بھی فرماتے ہیں۔ مگر بہت شاذ۔ جب کوئی غیر ملکی سفیر پہلی مرتبہ سند سفارت شہنشاہ کے حضور میں پیش کرنے کے لئے محل میں حاضر ہوتا ہے تو اُس کے پورے اسٹاف کو محل کے باہر روک دیا جاتا ہے اور وہ تنہا۔ شہنشاہ کے حضور میں پیش کیا جاتا ہے۔ تین مرتبہ مختلف فاصلوں پر اسے حالت رکوع میں جانا پڑتا ہے۔ تب کہیں سند سفارت پڑھنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ اس رسم کے بعد شہنشاہ سفیر سے ترجمان کے ذریعے دو چار باتیں کرتا ہے۔ ترجمان کو نظر ملا کر بات کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ رسمی گفت و شنید کے بعد۔ سفیر کو پھر تین رکوع بجا لانے پڑتے ہیں اور یہ تقریب ختم ہو جاتی ہے۔

احمق نائب صدر

ایک مرتبہ امریکہ کے نائب صدر مسٹر گارنر۔ فلپائن جاتے ہوئے ٹوکیو پہونچے اور شہنشاہ نے انھیں باریابی کی اجازت بھی عطا کر دی۔ مسٹر گارنر نے اپنے امریکی دوستوں سے بطور مذاق کہا کہ:۔

جب وہ شہنشاہ کے حضور پہونچیں گے تو امریکہ کی وہ گھڑی (رسٹ واچ) شہنشاہ کو دکھلائیں گے جو صرف ایک ڈالر میں فروخت ہوتی ہے اور ہز مجسٹی سے عرض کریں گے کہ جہاں پناہ! صرف یہ چیز ایسی ہے۔ جس کی نقل جاپانی نہیں کر سکتے اور اگر کریں بھی تو اس قسم کی گھڑی کو ایک ڈالر سے کم میں فروخت کرنے پر قادر نہیں ہو سکتے" ۔۔ جب مسٹر گارنر کی یہ تجویز ان کے امریکی دوستوں نے سنی تو وہ خوفزدہ ہو گئے اور انہوں نے امریکی نائب صدر سے کہا کہ:

خدا کے لیے ایسا نہ کیجئے۔ اگر آپ نے یہ لفظ شہنشاہ کے سامنے ادا کئے تو ہز مجسٹی کا اے۔ ڈی۔ سی سمجھے گا کہ آپ نے ذات شاہانہ کی توہین کی ہے۔ اور وہ غیرت کے مارے خودکشی کرلے گا۔

بہرحال مسٹر گارنر اس ارادے سے باز رہے۔ اس لئے بھی کہ انہوں نے مصنوعی اگر سول امریکی گھڑیاں ٹوکیو کے بازاروں میں صرف تیس[؟] سینٹ میں بکتی ہوئی دیکھیں۔ شہنشاہ نے اپنے ۲۲ سالہ عہد حکومت میں صرف تین غیر ملکی صحافیوں کو شرف ملاقات بخشا ہے۔ جولیس تسوردین ایک فرانسیسی صحافی وارڈ پرائس ڈیلی میل کا نامہ نگار اور رائے۔ ڈبلیو۔ ہاورڈ۔ البتہ جب شہنشاہ صرف ولی عہد تھے تو سٹرڈے ایوننگ پوسٹ کے نمائندے مسٹر اسحاق مارکوسن نے اُن کا انٹرویو لیا تھا۔ اس کے بعد شہنشاہ نے کسی اخبار نویس کو انٹرویو کی عزت نہیں بخشی۔ گو (صرف تین کو) ملاقات کی اجازت ضروری ہے۔ سال میں دو بار۔ اپریل اور نومبر میں شہنشاہ "دعوت عام" دیتے ہیں جن میں کم و بیش، ہزار مہمان شرکت کرتے ہیں۔ ان پارٹیوں میں ٹوپی (ہیٹ) پہننے کی اجازت ہے۔ لیکن کتنی ہی سردی ہو۔ اوور کوٹ پہننے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ شہنشاہ اور ملکہ۔ آہستہ آہستہ مہمانوں کی صفوں میں سے گزر جاتے ہیں اور دعوت ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ دعوتیں بھی ۱۹۳۷ء میں ختم ہو گئیں اور اُس کے بعد شہنشاہ نے کوئی "گارڈن پارٹی" نہیں دی۔ جب کوئی غیر ملکی بادشاہ ٹوکیو کے دورے پر آتا ہے تو شہنشاہ کی طرف سے ڈنر دیا جاتا ہے۔ مثلاً اگر برطانیہ کا کوئی رائل پرنس جاپان کے دورے پر آئے تو اسے شہنشاہ کی طرف سے ڈنر دیا جائیگا اور بادشاہ و ملکہ (حالانکہ انگریزی بول سکتے ہیں) جاپانی زبان میں ترجمان کے ذریعے مہمان سے گفت و شنید کریں گے۔ ان شاہی دعوتوں میں بھی خود شہنشاہ کی کرسی اپنے شاہی مہمان سے بلند ہوگی۔ اللہ رے رکھ رکھاؤ! ہر سال شہنشاہ۔ غیر ملکی سفیروں کو نشان نوازش کے طور پر "چائے کی پیالی" عطا فرمایا کرتے ہیں۔ (یہ بھی ایک قدیم رسم ہے)۔ اگر آپ ٹوکیو میں کسی غیر ملکی سفیر سے ملنے جائیں تو اس کے ڈائننگ روم میں چائے کی پیالیوں کو (جو عام طور پر کمرہ طعام میں زینت

---

[۱] جاپانیوں کے عقائد و مذاہب کی تاریخ از۔ ڈبلو۔ سی۔ ولیم۔ مطبوعہ نیویارک۔

کے طور پر رکھی جایا کرتی ہیں) شمار کر کے اس کی مدت قیام کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ فی سال ایک پیالی کا خلیہ!

شہنشاہ۔ گولف اور ٹینس کھیلتے ہیں۔ لیکن صرف محل کے اندر۔ اُن کا دوسرا "مشغلہ" بحری حیاتیات' کا مطالعہ ہے جب بھی کوئی ممتاز عالم حیاتیات (بیالوجسٹ) ٹوکیو جائے گا۔ شہنشاہ اسے ضرور اپنے محل میں بلائیں گے اور آزادی کے ساتھ علمی مسائل پر گفت و شنید کریں گے۔ تاہم ان ملاقاتوں کا سرکاری طور پر کبھی اعلان نہیں کیا جاتا۔ ان کے محل کے متعدد کمرے۔ فن حیاتیات کی تجربہ گاہ میں منتقل ہو گئے ہیں۔ جہاں شہنشاہ، بڑی خوشی کے ساتھ اپنے مائیکروسکوپ (خوردبین جراثیم) کے ذریعہ عضویات اور نشوونما حیوانی کے مطالعے میں مصروف رہتے ہیں۔ شہنشاہ کو فوٹوگرافی اور سواری کا بھی شوق ہے اور برج پر کھیلنے کا بھی۔

وہ بہت سویرے خواب گاہ میں چلے جاتے ہیں اور صبح چھ بجے اٹھ جاتے ہیں۔ شراب اور تمباکو سے انھیں نفرت ہے۔ خیال یہ ہے کہ ان کی صحت بہت عمدہ ہے۔ تاہم نظر کمزور ہے۔ شہنشاہ کی ایک ادا یہ بھی ہے کہ وہ ایک کپڑے کو کبھی دوبارہ نہیں پہنتے یہاں تک کہ زیر جامگی (UNDERWEAR) ایک مرتبہ کے استعمال شدہ کپڑے۔ خدام اور چھوٹے موٹے افسروں کو دیئے جاتے ہیں اور اسے بہت بڑا انعام سمجھا جاتا ہے۔ تاجدار جاپان ہمیشہ بادامی (قرمزی) رنگ کی لیموسن گاڑی میں باہر نکلتے ہیں۔ موٹر کا یہ رنگ صرف شاہی خاندان کے لئے مخصوص ہے۔ جس جس راستے سے شاہی سواری گزرتی ہے۔ اس کی سختی کے ساتھ نگرانی کی جاتی ہے۔

موجودہ شہنشاہ جاپان۔ پہلے حکمران ہیں۔ جنہوں نے بیرونی ملکوں کی سیاحی کی ہے۔ مگر کس طرح؟ جب ۱۹۲۲ء میں یہ اعلان ہوا کہ ولی عہد۔ جاپان سے باہر جا رہے ہیں تو جاپان کے ایک سو لڑکوں نے "ہاراکری" کا اعلان کر دیا۔ بہر حال شہنشاہ نے بحالت ولی عہدی ایک جنگی جہاز کے ذریعہ بحری سفر شروع کیا۔ لیکن وہ شاہی جہاز عام راستوں کے بجائے گہرے سمندروں میں سفر کرتا ہوا۔ یورپ پہونچا۔ شہنشاہ کبھی اپنے (مبارک) ہاتھوں کو سونے چاندی جیسی نجس چیزوں سے آلودہ نہیں کرتے۔ لندن میں عجب لطیفہ پیش آیا۔ ولی عہد جاپان لندن کی زیر زمین ریلوے میں سوار ہوئے لیکن ٹکٹ نہ خرید سکے۔ کیونکہ اُن کے پاس سکّے موجود نہ تھے۔ اس سفر کے دوران ولی عہد نے جبل الطارق میں گھوڑوں کی ریس دیکھی اور ایک گھوڑے پر شرط بدلی۔ ولی عہد جیت گئے پھر جب (جیتے ہوئے) کرنسی نوٹوں کا بنڈل اُن کی خدمت میں پیش کیا گیا تو ولی عہد نے گھبرا کر وہ (ہزار دس پونڈ مالیت کے) نوٹ۔ ایڈمیرل اگوری کی طرف پھینک دیئے کہ انھیں ٹھکانے لگاؤ۔ ایڈمیرل آگوری۔ سیاحت یورپ میں ولی عہد کے اتالیق کی حیثیت سے شریک تھے[1]

سنہ ۱۹۳۰ء تک خود عام جاپانی بھی اس وہم میں مبتلا تھے کہ شہنشاہ ہیرو ہیتو کوئی فوق البشری وجود رکھتے ہیں۔ لیکن ۱۹۳۰ء سے یہ کوشش کی گئی کہ شہنشاہ کی شخصیت کے انسانی پہلو بھی کبھی کبھی عوام کے سامنے پیش کئے جائیں۔ تاہم آج بھی اُن کے وجود کا آسمانی پہلو۔ زمینی پہلو پر غالب ہے۔ ۱۹۳۰ء تک شہنشاہ نے ریڈیو کے ذریعہ کبھی عوام سے براہ راست خطاب نہیں کیا تھا۔ مگر اس کے بعد چند مرتبہ لاسلکی کی لہروں کو ہز امپیریل مجسٹی کی مقدس آواز نشر کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ۱۹۴۰ء کے بعد سے شہنشاہ کی زندگی کے سیاسی پہلو بھی منظر عام پر آئے۔ مثلاً ۱۹۴۱ء میں ٹوکیو سے اعلان کیا گیا کہ خود ہز امپیریل مجسٹی نے۔ جاپان کی تمام۔ بحری۔ بری۔ اور فضائی فوجوں کی کمان سنبھال لی ہے۔ اسی زمانے میں شہنشاہ نے بذات خود۔ صدر روزویلٹ کی اس اپیل کا جواب دیا۔ جو انھوں نے قیام امن کے سلسلے میں جاپانی قوم سے کی تھی۔ دوسری عالمگیر جنگ کے دوران (۴۵-۱۹۳۹ء) چین۔ مانچوریا۔ ہانگ کانگ۔ تھائی لینڈ۔ ہند چینی۔ برما۔ ملایا۔ سنگاپور۔ سماٹرا۔ جاوا۔ سیلی بیز۔ اور فلپائن وغیرہ میں جاپانی فوجوں نے تمام خونریز لڑائیاں۔ شہنشاہ کے نام پر لڑیں۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ ان لاکھوں مربع میل کے علاقوں میں لڑی جانے والی تباہ کن معرکہ آرائیوں کی منصوبہ بندی

---

[1] لندن ٹائمز جلد ۱۹۲۳ء

پیش قدمی اور دفاع میں شہنشاہ کا ذرا سا بھی حصہ نہ تھا۔ صرف جنگی سپہ سالاروں کی کونسل تھی۔ جوان عظیم پیش قدمیوں کی تجویزیں مرتب کرتی تھی
عجیب بات یہ ہے کہ جاپانی قوم کے خلاف جان کی بازی لگا دینے کے باوجود۔ زمانۂ جنگ میں بھی امریکہ اور برطانیہ کو اس بات کی جرأت نہ ہو سکی کہ وہ شہنشاہ ہیرو ہیتو کو ہدف ملامت بنا سکیں۔ عین لڑائی کے زمانے میں بھی اتحادی قوموں کے ریڈیو۔ جہاں جاپانی قوم کے خلاف طرح طرح کے مغلظات بکتے تھے۔ مثلاً زرد سُور۔ مشرق کے آدم خور۔ جبشی نسل۔ پیلے یہودی وغیرہ وغیرہ — وہاں کبھی شہنشاہ کے متعلق ایک لفظ نہیں کہا گیا۔ اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ باوجود یکہ جاپان ۳۶ء سے ۴۵ء تک محوری طاقتوں کا رکن رہا۔ اور ہٹلر و مسولینی بار بار جاپانی وزیر اعظموں سے ملتے جلتے رہے۔ تاہم شہنشاہ نے کبھی نازی جرمنی کے فیوہرر اور فسطائی اطالیہ کے ڈوچے — مسولینی — کو اس کی اجازت نہیں دی کہ وہ شہنشاہ سے ملاقات کی تمنا کر سکیں — اگست ۱۹۴۵ء کے پہلے ہفتے میں امریکہ نے جاپان کے خلاف (ہیروشیما اور ناگاساکی پر) پہلی مرتبہ ایٹم بم استعمال کئے اور چند روز بعد جاپانی قوم نے ہتھیار ڈال دئے۔ جاپان کے لیے یہ بڑا نازک وقت تھا۔ غضب ناک امریکی فوجیں ایٹم بموں سے مسلح جنرل میک آرتھر کی قیادت میں ٹوکیو کی طرف بڑھ رہی تھیں اور ساری دنیا بیتابی سے شکست خوردہ جاپانیوں کی طرف دیکھ اور سوچ رہی تھی کہ دیکھیں۔ اتحادی فاتح اپنے بہادر مفتوحین کے ساتھ کیا ذلت انگیز برتاؤ کرتے ہیں؟ لیکن کیا ہوا؟ ہوا یہ کہ فاتح جاپان میک آرتھر نے ٹوکیو پہنچکر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ شاہی محل میں جا کر شہنشاہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا اور جاپانی قوم۔ تباہی سے بچ گئی۔ بقول جاپان ٹائمز۔

"ایک فوق البشر (شہنشاہ) نے کروڑوں انسانوں کو بچا لیا"۔

جب کہ ہٹلر اور مسولینی۔ دونوں کو تاوان جنگ میں اپنی اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا یعنی۔ ہٹلر نے (۳۰ اپریل ۴۵ء کو) برلن چانسلری کے تہ خانہ میں خودکشی کر لی اور مسولینی کو شمالی اطالیہ کے ایک قصبہ میں گولیوں کا نشانہ بننا پڑا۔ اور پھر اس کی خونچکاں لاش کو اوندھا لٹکا یا گیا — جنگ کے بعد حالات بدل چکے ہیں۔ مگر شہنشاہ سے لوگوں کی عقیدت کا عالم وہی ہے۔ چند ہفتے ہوئے کہ شہنشاہ کے مشکوئے معلی میں (ولی عہد جاپان کے یہاں۔ جنہوں نے ایک عامی کی لڑکی سے شادی کر لی ہے) پوتے کی ولادت ہوئی تو سرکاری طور پر تین ہفتے جشن منایا گیا۔ آج جاپانی ڈائٹ (پارلیمنٹ) میں کمیونسٹ پارٹی بھی موجود ہے سوشلسٹ پارٹی بھی۔ امپریلیسٹ گروپ بھی نظر آتا ہے۔ نیشلسٹ جماعت بھی۔ یہ پارٹیاں ہر مسئلے میں ایک دوسرے سے اختلاف رکھتی ہیں بجز ایک مسئلے کے۔ یعنی شہنشاہ کی پوجا کا عقیدہ — حال ہی کا واقعہ ہے کہ شہنشاہ کی سواری کسی مقام سے گزر رہی تھی۔ کہ ٹریفک کے سپاہی نے غلط راستے کا سگنل دے دیا۔ جب اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوا تو اُس نے خودکشی کر لی — شہنشاہ سے آنکھ ملا کر بات چیت کرنا گناہ تصور کیا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ بحری بیڑے کے معائنے کے وقت اتفاقاً ایک امیر البحر کی نظر شہنشاہ پر پڑ گئی۔ اس نے معائنہ کے بعد سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی کنپٹی میں گولی مار لی۔

اس عظیم المرتبت اور پُر اسرار زندگی بسر کرنے والے شہنشاہ کی زندگی کا سب سے زیادہ نازک پہلو یہ ہے کہ وہ (عالم حیاتیات ہونے کے ساتھ) شاعر بھی ہے۔ وہی نہیں بلکہ پورا خاندان۔ آغاز سال میں دربار شاہی کے زیر اہتمام مصرع طرح (نہیں۔ بلکہ موضوع مقررہ) پر مشاعرہ منعقد ہوتا ہے۔ جس میں ہر شاعر کو مقابلے کی دعوت دی جاتی ہے اور ہدایت کی جاتی ہے کہ ۳۱۔ مصرعوں کے قطعے (TANKR) کی صورت میں نظمیں لکھی جائیں۔ اس مشاعرہ کے لیے خود شہنشاہ بھی ہر سال نظم لکھتے ہیں۔ بیگمات بھی۔ شاہزادے بھی اور درباری بھی۔ امتحان گاہ شعر میں سب سے پہلے شہنشاہ کی نظم پڑھی جاتی ہے، پھر شاہزادوں کی — لیکن از راہ ادب ان نظموں کو انعامی مقابلے سے بلند کہا جاتا ہے۔ ۶۳ء کے مشاعرے میں ۱۷ ہزار نظمیں پیش کی گئی تھیں۔ اور ۶۴ء میں — ۳۰ ہزار — ۶۵ء میں یہ تعداد ۲۷ ہزار رہ گئی — لیکن ۵۲ء میں بڑھکر ۴۶ ہزار ہو گئی[1] اس مشاعرے کے لئے شہنشاہ نے حسب ذیل قطعہ کہا تھا۔

---

[1] جاپانی ادبیات۔ از پروفیسر ہنڈرسن۔ نیویارک ٹائمز۔ میگزین سیکشن۔

شی نوگی بلند چوٹیوں پر[1]	*As I was visiting*
دیکھا ہے عجیب میں نے منظر	*The shino point in hil*
ہر سمت رواں دواں گریزاں	*clouds were drifting*
دریا پہ وہ بادلوں کا لشکر	*for over the sea*

۱۹۲۸ء میں شہنشاہ ہیرو ہیتو نے اس مشاعرے کے لئے حسب ذیل مصرعے نظم کئے:

مندر کے باغ میں ہے بہت پر سکوں سحر	*Peaceful is morning*
گیتی کی وضع تازہ بھی ہے پُر اُمید تر	*in the shrine garden*
مشکل نہیں ہے امن و سکون دہر میں مگر؟	*World condition it is hoped will also be peaceful*

اس سلسلے کا آخری قطعہ یہ ہے (شہنشاہ کی تازہ ترین ادبی تخلیق)

آغاز سال پر! —	*As the new year begins*
اپنی دعا ہے مشرق و مغرب کے واسطے	*We pray*
دونوں میں اتحادِ عمل کی طلب بڑھے	*That the east and west*
مخلص ہوں ہم اگر — آغاز سال پر	*will live and prosper together*

[1] یہ ترجمہ نہیں ہے۔ اردو نظم میں اصل مصرعوں کا صرف مفہوم پیش کیا گیا ہے۔

شکیل عادل زادہ

بہن سے متعلق

پانی - پانی دیجیے کرنل صاحب پانی -

کرنل نے اسے پانی پیش کیا اور معنی خیز انداز سے کمرے پر نظر ڈالی -

عجیب و غریب سکوت - گہری خاموشی - کانپتا ہوا ماحول دہشت ناک سائے —

اُف! تم واقعی کتنے خطرناک ہو - کتنے معصوم انسانوں کا تم نے خون بہایا ہے - مجھے اعتراف ہے کہ جیل کی بامشقت اور ذلیل زندگی میں بھی تمہارے چہرے سے وہ شان و شوکت اور جاہ و جلال نہیں دور ہو سکا جس نے تمہیں اپنے تمام ساتھیوں سے ممتاز بنا دیا تھا — مگر تم واقعی کتنے کریہہ اور سیاہ قلب ہو —

— کرنل صاحب! امیر علی دو زانو ہو کر بیٹھ گیا -

کرنل صاحب — میں نے اپنی ساری زندگی شریف زادوں کی طرح بسر کی ہے - میں نے جو کچھ کیا وہ ایک مقدس پیشے کی عظمت اور بقا کی خاطر کیا - کون کہہ سکتا ہے کہ امیر علی نے کبھی اپنے فرائض میں کوتاہی کی - اپنے پڑوسیوں اور عزیزوں کے ساتھ دغا کی - میں ایک عظیم تحریک سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اس کے عقائد، اصول اور رسم کا پابند تھا - خدائے رب العزت کا شکر کس طرح ادا کروں کہ اس نے مشکل سے مشکل وقت میں میری رہنمائی فرمائی - میں روزہ نماز کا عادی رہا ہوں اور الحمدللہ اس پر قائم ہوں -

لیکن یہ قتل و غارتگری — معصوم انسانوں کا بے دریغ خون - یہ جرائم؟ کرنل طنزیہ لہجہ میں بولا -

اللہ تبارک تعالیٰ نے مجھے اس کام پر مامور کیا تھا - مجبور کیا ہوں؟ میرے ہاتھوں میں اتنی طاقت کہاں کہ اپنے ہم جنس کی جان لے سکوں — یقین مانئے اس قتل و غارتگری کے پیچھے خدا کا بہت بڑا مقصد پوشیدہ ہے - میں کیا کر سکتا ہوں؟ میری حیثیت ہی کیا ہے - خود سوچئے وہ لوگ کیسے مر جاتے؟ کیوں مسافر راہ بھٹک کر ہمارے خیموں میں آ جاتے تھے کرنل صاحب! ان اسرار و رموز کو خدا ہی بہتر جانتا ہے - اس کی اجازت کے بغیر پتہ نہیں ہل سکتا - ان باتوں کو چھیڑنا نادرست ہے - اچھائی برائی سب خدا کی طرف سے ہے -

امیر علی! جس کے جاذب نظر چہرے پر ہزار داستانیں پوشیدہ ہیں قتل و خون کی داستانیں - درندگی و بربریت کی کہانیاں - امیر علی کی کہانی خود اس کی زبانی —

زمانہ ہے ۱۸۴۲ء کا — جب انگریز رفتہ رفتہ ہندوستان کی ریاستوں پر غالب آ رہا تھا اور کوئی بہت ہی بڑی سلطنت قائم کرنے کی تگ و دو میں مصروف عمل تھا ———

سرکار! ہمیں شک ہوگیا کہ کسی طرح راجہ جالون کو ہمارے متعلق پتہ چل چکا ہے۔ اس زمانے میں والد صاحب قبلہ نے ٹھگی چھوڑ کر گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی۔ اب ہمارا یہ معمول ہوگیا تھا کہ ہم سال میں دو تین بار مہم پر روانہ ہوتے اور کثیر دولت فراہم کرکے گھر واپس آجاتے۔ بقیہ دن آرام سے گزر جاتے تھے۔ ان خالی دنوں میں مالگزاری کا کچھ کام اپنے ذمے لے لیا تھا۔ جالون میں ہر شخص کی نگاہوں میں ہمارے لئے عزت اور وقعت نمایاں تھی اور ایمان کی بات ہے کہ ہم ایمانداری۔ دیانتداری اور انصاف سے مالگزاری وصول کرتے تھے۔ میں سردار تو ہو ہی گیا تھا اور مختصر سے عرصہ میں بے پناہ مقبولیت حاصل کرلی تھی اس لئے ٹھگوں کی عموماً یہ خواہش رہتی تھی کہ وہ میری ماتحتی میں کام کریں۔ ہم نے بڑے بڑے لشکر تیار کئے۔ بڑے پیمانے پر لوگوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ میرا عقیدہ ہے کہ یہ سب متبرک بھوانی کا کرم تھا کہ میں نے کسی میں اتنا بڑا منصب اور اتنی زیادہ مقبولیت حاصل کرلی تھی۔

نہیں! کرنل بولا۔ اسمیں تمہاری خداداد ذہانت اور وجیہہ شخصیت کو بھی دخل تھا۔

ہاں! ممکن ہے ایسا ہو۔ امیر علی نے سر ہلا دیا۔ اور اپنے کارناموں کی ایک طویل فہرست کرنل میڈوز ٹیلر کے حضور گوش گزار کی۔

جالون کے راجہ کو جب ان پر شبہ ہوگیا تو امیر علی نے جالون چھوڑ دیا اور قبل اسکے کہ کوئی ایسی ویسی بات ہوجائے وہ ٹھگی کے باعزت پیشے کو ترک کرکے پنڈاریوں کے سردار چیتو کے یہاں حاضر ہوا چیتو نے آزمائش کے طور پر اپنے چیدہ چیدہ سرداروں سے اس کا مقابلہ کرایا۔ نیزہ اور تیغ بازی کا ماہر امیر علی سب پر غالب آگیا یہاں تک کہ چیتو کے عزیز سپہ سالار غفور خان کو بھی مقابلہ میں شکست نصیب ہوئی۔ امیر علی چند سو جوانوں کا سردار بنا دیا گیا۔

مراوتی اس زمانے میں دکن کا مالدار ترین مقام شمار کیا جاتا تھا طے ہوا کہ اسی جگہ سب سے پہلے کام کرنا چاہئے۔ چنانچہ پہلی ٹولی کے ساتھ امیر علی مراوتی میں داخل ہوا اور شہر کے ساہوکاروں سے جبریہ دس ہزار روپے وصول کرلئے۔ اس نے مطلع کیا کہ چند میل کے فاصلے پر چیتو کے پانچ ہزار مسلح جوانوں کا لشکر مراوتی کو لوٹنے کے لئے قدم بڑھا رہا ہے اس کے لئے کثیر تعداد روپیہ مہیا کیا جائے ورنہ سارے علاقے پر اسکا قہر و غضب نازل ہوجائیگا۔

شہر میں آگ لگادی جائیگی۔ آپ لوگوں کو قتل کردیا جائیگا۔ آپ کی باعصمت خواتین کو سر بازار رسوا کیا جائیگا — حسین و جمیل لڑکیوں کو پنڈاری اپنے ساتھ لے جائیں گے، جو انھیں عیش کے سامان مہیا کریں گی —

شہر والے کانپ گئے۔ مگر امیر علی نے انھیں اس امر پر راضی کرلیا کہ اگر وہ چیتو کی آمد پر اس کا پرجوش استقبال کریں اور خود ہی اس کے حضور میں تین لاکھ روپے کا نذرانہ پیش کریں تو شاید مراوتی پانچ ہزار مسلح لشکر کی زد سے بچ جائے۔ یہ تجویز بالآخر قبول کرلی گئی اور اس کی کامیابی کے بعد امیر علی کو پانچسو روپے کا مزید عطیہ پیش کرنے کا وعدہ کیا گیا۔ امیر علی نے شہر کے لوگوں کو چیتو کے مظالم اور درندگی کے واقعات سنا کر دہشت پھیلا دی۔ جب ایک بڑے لشکر کے ساتھ چیتو نے مراوتی کی سرحدوں پر قدم رکھا تو خلاف توقع اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔ مراوتی کو دلہن کی طرح سجایا گیا۔ خوشی کے ترانے گائے گئے۔ چیتو زندہ باد کے نعروں سے مراوتی کی فضا گونج اٹھی، اس عدیم المثال استقبال سے چیتو کو تشویش ہونے لگی۔ امیر علی نے یہ عقدہ کھولکر یہ سب کچھ اس کی ذہانت کا کرشمہ ہے اسے تعجب میں ڈالدیا۔ شام ہوئی تو پنڈال سجایا گیا۔ انواع و اقسام کے کھانے پانچ ہزار مہمانوں کو کھلائے گئے چیتو کی خدمت میں بیش قیمت خوان پیش کئے گئے۔ سودا ہوا اور طے پایا کہ پونے چار لاکھ روپے دیکر مراوتی کو ظلم و ستم سے بری کردیا جائے۔ حسب الحکم عطیہ پیش کیا گیا۔ یہ کام بڑا عجیب تھا۔

امیر علی کو اس کام سے دلچسپی ہونے لگی اس نے باقاعدہ طور پر پنڈاریوں کے متعلق سوچنا شروع کردیا۔

پنڈاری۔ ظالم و جابر پنڈاری۔ جن کا کام تھا۔ لوٹ مار۔ ظلم و ستم۔ جبر و استبداد۔ قتل و غارتگری۔

ٹھگی اس سلسلے کی ستھری شکل تھی لیکن تھی یہ بھی مکروہ — ٹھگی میں درندگی کے بجائے صرف انسان کی جان لینے کا اصول رائج تھا۔ ان کے یہاں کچھ اپنے اصول اعتقادات اور رسم کے تحت انسان کے خون کا بازار گرم رہتا تھا۔ پنڈاریوں میں ہر کس و ناکس کو مارا جاسکتا تھا مگر ٹھگی میں چمار، دھوبی، تیلی، طوائفوں

اور معذوروں کو چھوڑ دیا جاتا تھا۔ عورتوں کی جان لینا بھی کچھ اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ لیکن دونوں کا مسلک ایک تھا ـــ نہیں ـــ مقصد بھی جدا تھا ـــ ٹھگی میں فناکی دیوی بھوانی اپنے پجاریوں سے ننانا کام لیتی تھی ـــ اور پنڈاری ـــ چیتو نے امیر علی کو رازدارانہ لہجہ میں بتلایا کہ پنڈاری جماعت ایک مقصد رکھتی ہے ۔ انگریز آہستہ آہستہ ہندوستان پر مسلط ہو رہا ہے ۔ ٹیپو سلطان ان سے لڑتے لڑتے مارے گئے ۔ جنوبی ہند کی ریاستیں انگریزوں کے قبضے میں جارہی ہیں ۔ اب مرہٹوں کی سلطنت قایم ہونے اور انگریزوں کو ختم کرنے کے لیے ہم میدان میں سرکف ہیں ۔

ـــ تین باتیں ! تمام دکن میں مرہٹوں کی حکومت ـــ انگریزوں کا خاتمہ ـــ سکندر جاہ کی معزولی ـــ مگر واقعہ یہ تھا کہ پنڈاری صرف ڈاکو اور لٹیرے تھے ۔ خونریزی ان کا شعار تھی ۔ چیتو اس جماعت کی آڑ میں بہت بڑے مقاصد کی تلاش میں سرگرداں تھا ۔ صرف چند سردار تھے جو اس راز سے واقف تھے ۔ عام پنڈاریوں کو یہی علم تھا کہ چیتو ایک ایماندار اور رحم دل سردار ہے اور ہم سب اس کے خادم ۔

امیر علی نے چیتو کی فوج میں ممتاز مقام حاصل کر لیا تھا ۔ چیتو کے منصوبے اتنے بلند تھے کہ کئی بار امیر علی کو رشک آیا ـــ یہ عین ممکن تھا کہ کسی ریاست پر قبضہ کرنے کے بعد چیتو وہاں کا راجہ ہو جاتا اور امیر علی ریاست کے کسی اعلیٰ عہدے پر فائز کر دیا جاتا ۔ لوٹ مار ۔ فسادات ۔ بلوہ ۔ خون ۔ وہ ان سب میں برابر کا شریک تھا ۔ اس کی پے در پے کامیابیوں اور بے پناہ ذہانت نے سپہ سالار غفور خان بھی حسد کرنے لگا ۔

غفور خان اپنی سنگدلی ۔ درندگی اور سفاکی کی وجہ سے دور دور مشہور تھا ۔ امیر علی صرف قاتل تھا ۔ اسے غفور خان کی درندگی سے نفرت تھی ۔ پنڈاری لوٹ مار کرتے ۔ بستیوں کو آگ لگا دیتے اور فصلوں کو تباہ و برباد کر دیتے تھے ۔ یہ انسان کے خون کے پیاسے تھے ۔ ہزاروں بستیاں تباہ ہو گئیں ۔ ایک بار چیتو نے امیر علی سے کہا کہ وہ سکندر جاہ کی آدھی سلطنت لوٹ چکا ہے ۔ آدھی ـــ سلطنت کو ـــ ابھی اور کمزور کرنا باقی ہے ـــ مگر امیر علی کا خیال تھا کہ چیتو کی ماتحتی میں جتنا روپیہ حاصل ہو سکے ۔ سمیٹا جائے ۔ تھوڑے عرصے میں وہ چیتو کا ہر دلعزیز ساتھی بن گیا ۔ سردار چیتو کا ساتھی ۔ اُسنے غفور خان کے متعلق بھی سوچا ۔ غفور خان جیسے انسانوں کو مختلف سزائیں دیکر مارنے میں مزہ آتا تھا ۔ جان لینے سے پہلے انسانوں کو مختلف قسم کی اذیتیں پہونچانا اس کا محبوب مشغلہ تھا ۔ اعضا کی مختلف طریقوں سے تراش خراش کی جاتی تھی ۔ مظلوم انسانوں کو رسیوں سے جکڑ کر اُن کے سامنے اُن کی نوجوان اور کنواری لڑکیوں کو بے عصمت کرنا عام سی بات تھی ۔ کئی بار امیر علی نے دیکھا کہ غفور خان نے نوجوان اور خوبصورت لڑکیوں کو اُن کے سرپرستوں اور بزرگوں کے سامنے عریاں کیا اور اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ وہ گناہ کے خوفناک کھیل کھیلیں ۔ بغیر کسی تردد اور حجاب کے اپنی جنسی خواہشات کی تکمیل کریں ۔ ایسے مواقع ہزار بار نصیب ہوئے تھے اور ہزار بار غفور خان کی آواز گرجی تھی ۔

کم بختو ۔ حسن و جوانی کے سمندر میں غرق ہو جاؤ ـــ کھیلو ـــ خوب کھیلو ـــ مست ہو جاؤ ـــ اپنے آپکو
بھول کر ان چمکیلے جسموں میں گم ہو جاؤ ـــ ابھی وقت بہت ہے ۔ لشکر کے دوسرے آدمی بستی کو تباہ
کر رہے ہیں ـــ وہ سامنے دیکھو ـــ وہ چاند سے زیادہ حسین ـــ شراب سے
زیادہ پیاری ... ـــ بہار سے زیادہ جواں ـــ دوشیزہ میرے لیے ہے ـــ اسکو
عریاں کر دو ـــ ... اسے میرے قریب لاؤ ـــ

یہ عجیب سی بات تھی کہ جنسی کشش کے درمیان بھی وہ مظلوم لڑکیوں پر ظلم و ستم کرتے تھے ۔ ان کے ذرا سے انکار پر کوڑے لگائے جاتے تھے ۔ اور اقرار کے بعد بھی انھیں اذیت پہونچائی جاتی تھی ۔ رخساروں کا بوسہ لیتے ہوئے انھیں بری طرح کاٹ لیا جاتا تھا کہ ان سے خون چھلکنے لگتا ۔ اُنکے سینوں پر گھونسے لگائے جاتے تھے انھیں بُری طرح زد و کوب کیا جاتا تھا ۔

مگر ٹھگی میں عورتوں کو مارنا بزدلی کی دلیل تھی ـــ یہاں تو حد ہو گئی تھی ۔

امیر علی نے کئی بار غفور خان کو سمجھایا — غفور خان چیتو کی فوج میں سپہ سالار کے عہدے پر فائز ہونے کی وجہ سے امیر علی سے بلند تھا۔ اُس نے امیر علی کو جھڑک دیا مگر امیر علی نے بھوانی کی قسم کھائی کہ وہ اُس کے قدموں میں غفور کا خون پیش کریگا۔ یہ کام بڑا دقت طلب تھا کس طرح ممکن تھا کہ ایک بہت بڑے لشکر کے بہت بڑے سردار غفور خان کو قتل کرنے کے منصوبے پر عمل کیا جاسکے۔ امیر علی نے مسئلے کے تمام پہلوؤں پر کافی غور خوض کیا۔ چند ساتھیوں سے مشورہ کرنے کے بعد بھی کوئی قابل عمل ترکیب ذہن میں نہ آسکی۔ یہ جذبہ شدت اختیار کرتا گیا۔ کرنل میڈوز ٹیلر اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ ایک واقعہ کو سناتے ہوئے امیر علی کی آنکھیں سُرخ ہوگئیں۔

رات بڑی سیاہ تھی۔ پنڈاریوں کے لشکر پر سکوت طاری تھا۔ خیموں میں مشعلیں دم توڑ چکی تھیں لیکن غفور خان کا خیمہ اب بھی روشنیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا — دور سے آواز آئی کسی کے سسکنے کی۔ رات کی تیرگی میں دلدوز چیخیں امیر علی کے کانوں سے ٹکرائیں۔ کس میں ہمت تھی جو غفور خان کے خیمے میں قدم رکھتا۔ ایک طرف چیتو تھا — اور چیتو کا خیمہ دور تھا۔ خود پنڈاری غفور خان کے مظالم سے خوف کھاتے تھے۔ چیتو کا دست راست لشکر کا سب سے زیادہ سفاک وظالم انسان غفور خان — آہ! ایک خوبصورت کمسن لڑکی کو اپنی وحشیانہ حرکات کا ہدف بنا رہا تھا — ۱۵ سالہ معصوم لڑکی بُری طرح چیخ رہی تھی۔ امیر علی اس قیامت خیز آہ و بکا کی تاب نہ لاسکا۔ اُسنے خیمے میں داخل ہوکر عجیب سا منظر دیکھا — نیم عریاں لباس — میں اپنے جسم کو سمیٹی ہوئی ایک حسین لڑکی۔ اُسنے امیر علی کو رحم طلب نظروں سے دیکھا — یاس و حسرت — غم واندوہ کا یہ خوبصورت مجسمہ غفور خان کی فولادی آغوش میں تڑپ رہا تھا —

ہا ہا ہا — غفور خان نے ایک طویل قہقہہ مارا — تم۔ امیر علی — اس مہ جبیں لڑکی کے لئے؟ کل تمھیں یہ سونپ دی جائے گی۔ مگر اسوقت یہ میری ہے —

غفور خان کی اس دیوانگی میں دخل دینے سے معاملہ طول پکڑ سکتا تھا۔ وہ خیمہ سے باہر چلا آیا۔ رات بھر وہ لڑکی چیختی رہی۔

علی الصبح وہ پھر غفور خان کے خیمہ میں گیا۔ غفور خان مسکرایا اس نے بیش قیمت پلنگ پر لٹکے ہوئے پردے کی ڈوری کو جنبش دی۔

اُف! ریشمی گدوں کے نرم و نازک پلنگ پر وہی نازک اندام — حسین و جمیل۔ جوان سال لڑکی پلنگ پر بالکل عریاں پڑی ہوئی تھی۔

غفور خان پلنگ پر جھک گیا — اور برہنہ لڑکی کے چکیلے جسم پر انگلیاں پھیرنے لگا — کیسی ہے امیر علی — کیا خیال ہے؟

امیر علی کی آنکھوں میں خون اُتر رہا تھا۔ غفور خان کے منہ سے قہقہہ اُبل پڑا۔ اس نے لڑکی کو آغوش میں اُٹھا کر سیدھا کر دیا — معاذ اللہ خون میں لت پت عریاں جسم — جوان سینے پر خنجر پیوست۔ عجب دہشتناک منظر تھا — اُسنے غفور خان سے صرف اتنا کہا۔ امیر علی ان چیزوں کو پسند نہیں کرتا اور کسی ناپسندیدہ چیز کے وجود کو بھی برداشت نہیں کر سکتا۔

غفور خان نے ان باتوں پر توجہ نہیں دی۔ اسے معلوم تھا کہ امیر علی صرف چند سو جوانوں کا سردار ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کا ماتحت ہے — اُسے کیا معلوم تھا کہ یہی امیر علی کئی سو انسانوں کا قاتل، ٹھگوں کا چالاک۔ طاقت ور اور خوفناک سردار ہے۔

ادھر امیر علی نے غفور خان کے مظالم کی داد دینی شروع کر دی — غفور خان اس تبدیلی پر حیران ہوا اور بڑھ کر گلے لگا لیا اور رازدارانہ لہجہ میں بولا "اب تم سمجھ گئے —"

ایک روز امیر علی نے ٹھگوں سے مشورہ کرنے کے بعد سپہ سالار اعظم غفور خان کے اعزاز میں ایک دعوت منعقد کر ڈالی۔ غفور خان اپنے ساتھیوں کے ہمراہ امیر علی کے خیمہ میں آیا۔ شراب میں افیون ملادی گئی ستار کے شوقین غفور خان نے عالم مستی میں ساز کو چھیڑ دیا۔ امیر علی کے ساتھی موتی رام نے گانا شروع

کرکے سماں باندھ دیا ـــ دو بوتلیں ـ پے بہ پے جام اور وہ بھی افیون آمیز ـ موسیقی اور امیر علی کی شیریں کلامی نے اسے جلدی مدہوش کر دیا ـــ امیر علی نے ساتھیوں کو اشارہ کیا اور مخصوص رومال غفور خان کی موٹی گردن میں ڈال دیا گیا ـــ چند سیکنڈ بعد وہ اس جہاں سے رخصت ہو گیا۔ قبریں پہلے سے تیار ہو چکی تھیں جنھیں خیمے کے اندر ہی ایک پردہ لٹکا کر پوشیدہ کر دیا گیا تھا۔ باہر سائیس کو ختم کر کے دونوں لاشوں کو ایک ہی قبر میں دفن کر دیا گیا۔ اور زمین برابر کر دی گئی ـــ

تھوڑی دیر بعد اسی زمین پر امیر علی پلاؤ نوش کر رہا تھا اور مسکرا مسکرا کر اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا۔ بدترین انسان جانتا نہیں تھا کہ امیر علی سے واسطہ پڑا ہے۔ امیر علی جو ذہانت کا پتلا کہا جاتا ہے۔

غفور خان کے گھوڑے کو کاٹ کر ایک گہری کھائی میں پھینک دیا گیا۔

اس کے بعد ایسا چسکہ پڑا کہ امیر علی کے ساتھیوں نے پنڈاریوں کے دوسرے سرداروں کو بھی اسی طرح موت کے گھاٹ اتار دیا۔

غفور خان کی گمشدگی اور چیدہ چیدہ سرداروں کے رفتہ رفتہ غائب ہو جانے کی بنا پر چیتو کو تشویش ہوئی۔ امیر علی کو طلب کیا گیا تو اس نے لاعلمی ظاہر کی۔ لیکن یہ پتہ کسی نہ کسی طرح چل گیا کہ اس میں امیر علی کا ہاتھ ہے۔ قبل اس کے کہ چیتو کا قہر نازل ہوتا امیر علی اور اس کے ساتھی وہاں سے فرار ہو گئے۔ چند ساتھیوں کے تعاقب میں چیتو کامیاب ہو گیا۔

امیر علی نے جالون پہونچکر اپنی حسین بیوی عظیمہ کی آغوش میں دم لیا۔ ایک عرصہ تک ٹھگی یا پنڈاری کی کسی بھی مہم میں شریک نہ ہوا۔ گھر میں کافی دولت تھی ـــ

جالون میں چوٹی کے رئیس اور معاشرے کے اعلیٰ فرد ہونے کی حیثیت۔ یہ سب کچھ حاصل تھا۔ ہر چند طبیعت کا جوش و خروش اس سکون و سکوت کی طرف راغب نہیں ہوتا تھا تاہم کچھ دنوں کے لئے بہتر تھا کہ خاموش رہا جائے ـــ دو سال اسی طرح گزر گئے۔

اس عرصہ میں چیتو کے لشکر کا بھی شیرازہ بکھر چکا تھا۔ فرنگی پھر غالب آ رہے تھے۔ بہت سے سرداروں کو پھانسی کی سزائیں دی گئیں۔ خود چیتو ایک جنگل میں شیر کے ہاتھوں مارا گیا۔ پنڈاری تحریک دم توڑ چکی تھی۔ ادھر ایک بڑی مہم کا ارادہ کیا گیا مگر شگون موافق نہ آنے کی وجہ سے سفر کے ارادے ملتوی کر دیئے گئے۔ اس کے بعد سفر اختیار کیا گیا۔ امیر علی نے راجوں مہاراجوں یہاں تک کہ چوروں اور ڈاکوؤں تک کو نہیں چھوڑا۔

لیرا کے مقام پر جب امیر علی کا کارواں شکار کی تلاش میں مشغول تھا کہ اس کی ملاقات ایک جوان منشی سے ہوئی جس کے ساتھ اس کی خوش جمال بیوی بھی تھی۔ میاں بیوی دونوں سفر پر راضی ہو گئے۔ امیر علی انھیں اپنے قافلے میں لے آیا۔ لیرا کے لوگ امیر علی کو دیکھ کر شش و پنج میں پڑ گئے۔ پچیس سال قبل اسی شباہت کا ایک لڑکا اپنے والدین کے ہمراہ کھو گیا تھا۔ امیر علی نے شک و شبہات میں غرق لیرا کے باشندوں کو اپنا شجرہ نسب بتایا اور کہا کہ وہ سید ہے پٹھان نہیں۔ اس کا باپ زندہ ہے۔ (امیر علی اپنے مربی اسمٰعیل کو اپنا باپ سمجھتا تھا)

منشی کی حسین بیوی کی صراحی دار گردن میں ہزار بلاؤں کا مداوا انمول اور نایاب تعویذ تھا اور امیر علی کو ہر صورت اس تعویذ کو حاصل کرنا تھا ـــ لڑکی کے جوان چہرے پر بلا کی کشش تھی۔ ایسی مقناطیسیت کہ کئی بار امیر علی کا جی چاہا وہ اسے چوم چوم لے۔ اس کا دل لڑکی سے شدید، بہت ہی شدید محبت کرنے کے لئے تڑپنے لگا ـــ اس نے اس کے شوہر منشی کو ختم کر دیا ـــ اب وہ حسینہ تنہا تھی۔ مگر یہ تعویذ بہت اہم تھا ـــ بہت ہی زیادہ اہم ـــ نہ جانے کس دل سے امیر علی نے اس کا گلا گھونٹ دیا اور تین سیکنڈ بعد وہ اس جہاں کی قید و بند سے آزاد ہو گئی ـــ ہاتھ پاؤں ڈھیلے پڑ گئے ـــ اس کے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی اتنی کہ اس کی موت پر زندگی میں پہلی بار امیر علی کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے ایک بار اسے احساس ہوا وہ کتنا ظالم ہے کیوں ایک

تعویذ کے لئے اس نے اتنی پیاری لڑکی کو ختم کر دیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ اُس نے کوئی اچھا کام نہیں کیا ہے۔ اسے بے جان لڑکی پر رحم آیا جس کے خوبصورت چہرے پر پریشان زلفیں شکن در شکن۔ پیچ در پیچ اُلجھی پڑی تھیں۔ امیر علی نے اس کی پیشانی کو بوسہ دیا اور ٹھگی کے قوانین کے برخلاف اس کے کپڑے نہیں اُتارے گئے۔ اُسے باقاعدہ قبر میں دفن کیا گیا — ایک ہفتہ تک امیر علی کی طبیعت خراب رہی — اس واقعے نے نہ جانے کیوں اس کا قرار چھین لیا تھا —

مگر وہ تھی کون؟ — کون تھی وہ؟ —

کرنل آپ جانتے ہیں وہ روح کون تھی۔ آج اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی وہ مجھے پریشان کرتی ہے — آج بھی —

آج تک مجھے اس کا سادہ اور معصوم چہرہ یاد ہے — کرنل صاحب نہ معلوم کیجئے کہ وہ کون تھی —

امیر علی رونے لگا — ایک عرصہ بعد لکھنؤ جیل میں ایک بوڑھے نے میری زندگی کے صحیح حالات پیش کئے — اور مجھے معلوم ہوا کہ وہ پیاری لڑکی جسے لیر کے مقام یعنی اپنے آبائی وطن کے قریب زندہ درگور کر دیا گیا تھا — میری حقیقی بہن تھی — ان پاپی ہاتھوں نے — ایک بھائی نے اپنی بہن کی جان لے لی تھی —

مگر کرنل — یہ واقعہ بہت طویل ہے — میری خونریز داستان کے چند اہم باب باقی رہ جاتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ بہن کے اس دردناک اور شرمناک قصے کو پھر سے دوہراؤں اور اپنے ان زخموں کو کریدوں جو سڑ چکے ہیں — جن سے بدبو آتی ہے۔ اور جو اتنے بے حس ہو گئے ہیں کہ انھیں تکلیف کا احساس بھی نہ رہا۔

کرنل صاحب — جالون کے راجہ اور ٹھگی کی سہ روزہ گفتگو رنگ لائی۔ میری اکلوتی بچی کی شادی کی تقریب — تقریب کیا تھی ایک ہنگامہ — معلوم ہوتا تھا جیسے سارے جہاں کی بہار سمٹ کر میرے مکان میں آگئی ہے۔ سجی ہوئی حویلی۔ مہمانوں کی آمد آمد کا ہجوم۔ پر تکلف تواضع۔ کہ عین اسی وقت راجہ کے ہرکارے طلبی کا حکم لے کر آ دھمکے۔ ہزار منتوں اور خوشامدوں کے بعد بھی وہ نہیں ملنے — چار و ناچار شادی کے گھر کے تمام ہنگامے چھوڑ کر راجہ کے دربار میں والد صاحب اور میں حاضر ہوئے۔ کمبخت نے قتل و غارتگری کا الزام عائد کیا — اور ثبوت کے طور پر چشم دید گواہ پیش کئے۔

والد اس اچانک صورتحال سے گھبرا گئے، مگر بھرے دربار میں باآواز بلند گویا ہوئے۔

میری کیا ہے۔ میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ پاپی راجہ تو بھوانی کے مقدس پجاری کو ستا رہا ہے۔ ہاں مجھے اقرار ہے کہ میں نے ٹھگی کا مقدس پیشہ اختیار کیا تھا۔ برتر و بالا بھوانی کے لئے۔ میرا عقیدہ ہے کہ تجھ جیسے شخص کو بھوانی عبرتناک عتاب میں مبتلا کرے گی — میں عقیدے کا آدمی ہوں — عقیدے میں پناہ ہے — میں خدا کی رضا کے لئے سب کچھ کرتا تھا — میں نے ان گنت قتل کئے ہیں۔ موت اٹل ہے۔ ان تمام انسانوں کی موت میرے ہاتھوں لکھی تھی — ہاں ہمیں ٹھگ کہا جاتا ہے — ٹھگ —

راجہ کی آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ والد صاحب کو ہاتھی کی دم سے باندھ کر ہاتھی کو جالون کے راستوں۔ گلیوں اور بازاروں میں گھمانے کیلئے آزاد چھوڑ دیا گیا اُن کے جسم کے پرخچے اُڑ گئے۔ آہ جالون کے لوگوں نے اُن پر تھوکا۔ پتھر برسائے۔

افسوس! صد ہزار بار افسوس کہ یہ سب کچھ۔ میرے سامنے ہوا مجھے گرفتار کر لیا گیا اور جیل کی بدترین فضا میں چار روز مسلسل بھوکا پیاسا رکھا گیا۔ زبان باہر نکل آئی۔ بھوانی کا عذاب نازل ہو رہا تھا۔ جس شہر میں اپنی فیاضی۔ ایمانداری۔ تہذیب اور دولت کی وجہ سے مشہور رہا تھا آج وہیں کے

لوگ منہ چڑا رہے تھے۔ تھوک رہے تھے۔ قسم بھوانی کی جی چاہتا تھا کہ انسان کی پوری نسل کا خون پی لوں۔ پانچویں دن ایک شریف النسل شخص نے پانی پیش کیا۔

کرنل — جیل میں معلوم ہوا کہ عظیمہ نے — آہ میری حسین بیوی نے یہ خبر سُن کر کہ میں ایک خونخوار ٹھگ تھا اور کئی سو آدمیوں کا قاتل — خودکشی کر لی — گھر کو لوٹ لیا گیا۔ معصوم بچی کو ایک مُلّا نے گھر میں رکھ لیا۔

میں عبرتناک عذاب میں مبتلا تھا۔

چند دن بعد راجہ کے دربار میں پھر طلبی ہوئی اور پیشانی پر گرم جلتے ہوئے لوہے سے بدنما داغ لگا کر سرحد کی طرف دھکیل دیا گیا یہ ہے — میری پیشانی کا داغ — کرنل صاحب!

کرنل نے دیکھا۔ امیر علی کی پیشانی پر پیسے کی شکل کا ایک بدنما داغ تھا۔

آج وہ جیل میں ہے —

کرنل صاحب! معلوم ہے آپ کو — راجہ جالون کوڑھی ہو کر مرا — یقیناً یہ والد صاحب مرحوم و مغفور کی مضطرب روح تھی جس نے جالون کے راجہ سے انتقام لے لیا تھا — اور بھوانی دیوی کا عذاب و عتاب! ——————

سر والٹر اسکاٹ
اثر لکھنوی

"حبّ وطن"

کیا کوئی ایسا بھی زیر آسماں انسان ہے
روح جس کی اس قدر ویران ہے سنسان ہے
جس نے بھولے سے نہ ہو دل میں کہا
"یہ وطن ہے یہ مرا پیارا وطن"
اجنبی ملکوں سے پلٹا بھی مگر
دل میں شعلہ شوق کا بھڑکا نہیں
دھیان میں ایسا اگر بدبخت ہو
جائزہ لو اس کی حالت کا بغور
کوئی منظر اسکے گن گاتا نہیں
لمبے چوڑے لاکھ میں اس کے خطاب
نام میں بھی شان ہے اور طمطراق
بلکہ خاصا رعب ہے
مال و دولت جاہ و حشمت کی نہیں کچھ انتہا
دیکھنے میں تو ہے سب کچھ جب ٹٹولو کچھ نہیں

تہ بہ تہ اک پوٹ ہے لیکن جو کھولو، کچھ نہیں
کیونکہ اپنی خودنمائی کا یہ خود ہے شکار
عام شہرت اسکو حاصل ہو یہ ممکن ہی نہیں
موت اندر موت ہوگی اس کی موت
اس کمینی خاک میں مل جائے گا
تھا مرکب جس سے اس ننگ خلائق کا وجود
ہوگی نمدیدہ نہ کوئی آنکھ اُس کی موت پر
یاد کیسی اور کیسا احترام
دل سے ہوگا محو اس کا نام تک
بیکسی ماتم کرے گی قبر پر
ہر گھڑی ہر لحظہ ہر شام و سحر
نامرادی ساتھ دے گی گردش ایام تک
اک یہی دمساز ہوگی حشر کے ہنگام تک

باقر مہدی

لامکانی

ہجر کی آخری شب ہنس کے گذاری ہم نے
غم سے خود ہستیٔ موہوم سنواری ہم نے

ہم بھی خوش، دل بھی ہے خوش ہجر کے دن بیت گئے
حوصلے اتنے بڑھائے تھے کہ ہم جیت گئے

پہلے یہ خوف تھا کس طرح سے جی پائیں گے؟
چاک اتنے ہیں کہ دامن کو نہ سی پائیں گے!

کوئی اتنا بھی نہ پوچھے گا کہاں رہتے تھے
اک نشاں بھی نہ ملے گا کہ جہاں رہتے تھے

بیکسی کے لئے اک گھر تو بنایا ہوتا
حسرتوں ہی سے سہی اس کو سجایا ہوتا

غمگسار آئیں نہ آئیں، یہ مسرت ہوتی!
سر چھپانے کی ہمیں بھی تو ضرورت ہوتی!!

غیر ممکن تھا مگر پھر بھی سنواریں راتیں
ہم نے سڑکوں پہ جدائی کی گذاریں راتیں

اور یہ آخری شب ہنس کے گذاری ہم نے
زندگانی کو بدل ڈالا ہے اکثر غم نے

سید فارغ بخاری

لوک گیت

چاند سے بڑھکر روشن ہے پر چاند نہیں ہے نام   گردش میں رہتا ہے لیکن ساغر ہے نہ جام

نغموں کی جھنکار ہے لیکن ساز ہے اسکا خام

پھولوں کی خوشبو ہے پر گلشن میں ہے بدنام

کس کا کھیت ہے کس کا پانی کس کے ہیں یہ دانے   کس نے بویا، کس نے کاٹا، بھید نہ کوئی جانے

کس راہی نے چلتے چلتے بنے یہ تانے بانے

ڈگر ڈگر میں، نگر نگر میں پھیل گئے افسانے

سندر سندر دیکھ کے مکھڑا سب کا جی للچائے   لیکن اس آئینے میں لرزاں ہیں ایسے سائے

جو بھی دیکھے اس کو اپنا روپ نظر آ جائے

کون یہ تہمت اپنے سر لے، کون اسے اپنائے

وزیر آغا

دھوپ

دھوپ! سنہری دھوپ!!
جاڑے کا ٹھٹھرا ہوا موسم
بھوری گھاس پہ ہر سو شبنم
تھر تھر کانپے سارا عالم
کون سمے کا بدلے روپ؟
دھوپ! سنہری دھوپ!!

ٹیلے، جنگل، پیڑ پرانے
کہرے کی چادر ہیں تانے
ہونٹ رسیلے، نین سہانے
ہر شے نے بدلا بہروپ
دھوپ! سنہری دھوپ!!

سوکھے پتے، ننگی باہیں
پاؤں شل اور اجڑی راہیں
جھونکے جیسے ٹھنڈی آہیں
دور کہیں پورب میں دھوپ
دھوپ! سنہری دھوپ!!

الطاف مشہدی

غزل

کون اُترا نظر کے زینے سے
محفلِ دل سجی قرینے سے
شیخ صاحب مجھے عقیدت ہے
گنگناتے ہوئے مہینے سے
مے کو گلرنگ کردیا کس نے
خون لے کر کلی کے سینے سے
کوئی ساحل نہ ناخدا اپنا
ہم تو مانوس ہیں سفینے سے
کس کا اعجاز ہے کہ رندوں کو
چین ملتا ہے آگ پینے سے
پی کے جیتے ہیں جی کے پیتے ہیں
ہم کو رغبت ہے ایسے جینے سے
مے کی تقدیس کا جواب کہاں
داغ دُھلتے ہیں دل کے پینے سے
ہائے الطاف وہ عروسِ بہار
جھانکتی ہے جو آبگینے سے

محشر بدایونی

○

ہم ذرا مستِ ہوائے شہرِ گُل کیا ہو گئے
سب رفو جو داغِ پیراہن تھے رسوا ہو گئے

ساحلوں ہی کی شکستوں تک نہیں موجوں کا شور
شہر کے کچھ گھر بھی اِس موسم میں دریا ہو گئے

زخمِ منزل بھر دیئے تم نے مگر اے قافلو
اُن شبستانوں کا کیا ہوگا جو تنہا ہو گئے

غیرتِ کوزہ گری بھی سوچتی ہو گی کہ آج
ناسزا مٹی کے کوزے جام و مینا ہو گئے

ایسے چُپ ہیں حادثے کچھ دیر کی قربت کے بعد
جیسے ساری زندگی کے عہد ایفا ہو گئے

روزنوں نے راستے کھولے ہیں صحراؤں کی سمت
یا پھر اس بستی کے سب کوچے ہی صحرا ہو گئے

رہ گئے جو داغ اجالوں کے مرے بجھنے کے بعد
جاگنے والے اندھیروں کی تمنا ہو گئے

یہ ہماری سادگی ہے یا خلوص اس دیس کا
دو ہی دن میں ہم سے لوگ اتنے شناسا ہو گئے

کوکب عتیق

○

تری جفا کے علاوہ، تری خوشی کے لئے
ہزار غم ہیں زمانے میں آدمی کے لئے
غبارِ راہِ محبت پہ اک نظر یارو
کہ منتظر ہے کوئی راہ میں کسی کے لئے
چمن میں سوکھے ہوئے خار و خس کا ذکر ہی کیا
ترس گئے گل و لالہ بھی تازگی کے لئے
مسافرانِ محبت کے حوصلے دیکھو!
بھٹک رہے ہیں اندھیرے میں روشنی کے لئے
سب اپنے ذوق کی تسکین چاہتے ہیں یہاں
دگرنہ کون اٹھاتا ہے غم کسی کے لئے
ہمارے عشق کی روداد مختصر یہ ہے
کہ زندگی میں ترستے ہیں زندگی کے لئے
جنوں میں ہم سے بڑی بھول ہوگئی کوکب
سکون ہم نے گنوایا اک اجنبی کے لئے

ناہید عذریٰ ردولوی

○

سارا زمانہ دوست بنا ہے
ہم کو اک ایسا درد ملا ہے
دل کے چھالے پھوٹ بہے ہیں
کس نے تیرا نام لیا ہے
اہلِ خرد اک چال چلے ہیں
دیوانہ بدنام ہوا ہے
کیوں یہ خوشی میں آنکھ بھر آئی
اشکوں سے دامن بھیگا ہوا ہے
کیسی محبت کیسی وفائیں
کس نے کس کا ساتھ دیا ہے
کتنی بری ہے دل کی دھڑکن
اُن پر سارا حال کھلا ہے

قیصر تمکین

صبحی

آج کی رات نہ جانے کیوں بالکل اندھیرا تھا۔

صبحی کمرے میں اکیلی لیٹی تھی۔ جب اس کے پاس اپنے غم کو سینے سے لگانے کے سوا کچھ اور نہ رہ جاتا تو وہ اسی طرح اس کمرے میں آکر پڑ رہتی۔ یہ کمرہ گھر کے سب صاف ستھرے کمروں سے الگ تھا اس میں ہر وقت سیل کی وجہ سے ایک بدمزہ سی نمی رہتی تھی۔ اس کی کھڑکی صاف ستھری، سڑک مکان کے لان یا باغ کی طرف نہیں کھلتی تھی بلکہ اس کا رُخ اندھیری گلی کی طرف تھا جہاں کوٹھی کے نیچے رکشے والوں کی بستی تھی۔ کھڑکی سے میونسپلٹی کی لالٹین کی روشنی بڑے ماتمی انداز میں اس کمرے میں آکر پڑتی تھی جس سے صرف اتنا فائدہ ہوتا کہ صبحی کو اپنے پھپھولے پھلانے میں آسانی ہوتی تھی۔

جب وہ گھر بھر میں اپنی جگہ نہ ڈھونڈ پاتی یا ہنستے کھیلتے بچوں میں اس کو کوئی منہ نہ لگاتا تو وہ آکر اس کوٹھری نما کمرے میں آپڑتی اور میونسپلٹی کی لالٹین کی بتی کو بغور دیکھتی رہتی اس وقت نجانے اس کے ننھے سے ذہن میں کیا کیا باتیں ہوتیں جب تیز بارش اور طوفان کی رات کو میونسپل لالٹین کی ننھی سی بتی خوفناک جھونکوں کا ــــــ مقابلہ کرتی ہوتی تو صبحی کا دل بھی اس کے ساتھ ڈولتا رہتا۔ وہ اس نراش کے عالم میں بڑی بے کسی سے اس بتی کی جد و جہد کو دیکھتی رہتی۔ اس کے دل میں یہ بے چین تمنا جاگتی کہ طوفان گزر جائے اور یہ بتی برابر جلتی رہے۔ جب کبھی یہ بتی طوفانی ہواؤں کے مقابلے میں جیت جاتی اور اپنی مختصر زندگی کو بچا لینے میں کامیاب ہو جاتی تو صبحی بہت خوش رہتی۔

اس رات کو بھی بہت تیز بارش ہو رہی تھی اور چاروں طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا اور صبحی اس کمرے میں آگئی تھی۔ جب اُسنے دیکھا کہ میونسپل لالٹین بھی نہیں جل رہی ہے تو اُسکے ننھے سے دل کو چوٹ لگی ـــ اور وہ خود ہی گودڑ میں منہ چھپا کر سسکیاں بھرنے لگی۔

لیکن گھر میں سناٹا تھا۔ سب بچے اچھل کود میں مشغول تھے۔ کچھ تو اس تیز بارش میں خوش تھے اور کچھ اس وجہ سے کہ اس دن شکیل بھائی آگئے تھے۔

شکیل بھائی پندرہ بیس دن بعد جب بھی آتے تو بچوں کی پوری قوم میں ہنگامہ مچ جاتا۔ شکیل بھائی کو بچوں سے بہت محبت تھی اور اس لیے جب وہ آتے تو فرداً فرداً ہر بچے کے لیے کچھ نہ کچھ تحفہ ضرور لاتے سامان رکھتے ہی بچوں میں مقابلے شروع ہو جاتے۔ جنرل نالج کا مقابلہ انگریزی لفظوں کے معنی اور کون شہر کہاں واقع ہے وغیرہ وغیرہ جو بچہ صحیح جواب دیتا اس کو چاکلیٹ یا چونگم انعام میں ملتی۔ مگر صبحی اس ہنگامے سے دور دور رہتی ۔ اس سبب سے نہیں کہ وہ تنہائی پسند تھی بلکہ اس وجہ سے کہ وہ میلی میلی رہا کرتی تھی۔ اس کی ناک میں لٹکتا ہوا بلاق اور سر پر اُجڑے اُجڑے انداز میں بندھی ہوئی پٹیاں اور پرانے دھرانے کپڑے۔ یہ چیزیں بہرحال ایسی تھیں کہ بچوں سے ہزار محبت کرنے کے باوجود شکیل بھائی کبھی اس کی طرف نگاہ بھر کر بھی نہیں دیکھ سکے۔ ایک دفعہ عجیب واقعہ ہوا۔ شکیل بھائی نے پوچھا اچھا بچو بتلاؤ دنیا کا سب سے بڑا شہر کونسا ہے ـــ

بچے چپ ہو گئے، دو ایک نے جواب دینے کی کوشش میں کلکتہ بمبئی بتایا بھی۔ مگر پھر خاموشی ہو گئی، دو ایک منٹ بعد صبیحی نے جو بالکل کنارے الگ کھڑی تھی آہستہ سے کہا "لندن" — سب بچے چونک پڑے۔ شکیل بھائی نے بھی دیکھا مگر صبیحی پر نظر ڈالتے ہی ان کا جی عجیب سا ہونے لگا ایک گھناؤنی گندی لڑکی کھڑی تھی۔ جس کا نام بہت سنا تھا مگر یہ ایسی گندی ہو گی اس کا ان کو اندازہ بھی نہ تھا۔ انہوں نے چاکلیٹ یا چوئنگ گم بچانے کے لئے بات ٹال دینے کی کوشش کی۔ دوسرے بچوں کو بھی برا لگا کہ یہ کیوں بیچ میں بولی۔ سب سے زیادہ غصہ اس بات کا تھا کہ اُس نے صحیح بتایا تھا اور وہ لوگ بتا نہیں سکے تھے۔ حالانکہ تین دن پہلے جب لڑائی ختم ہونے اور ہٹلر کے ہارنے کی خبریں آ رہی تھیں تو میاں جان اور بڑے پاپا نے کہا تھا کہ لندن دنیا کا سب سے بڑا شہر ہے۔ مگر صبیحی کے سوا باقی سب بچے اس بات کو بھول چکے تھے۔

اس وقت ایک عجیب ناگواری فضا پیدا ہو گئی جس کو شریر ببو نے یہ کہہ کر دور کیا "سب سے بڑا شہر تیرا آگرہ ہے حلا مجادی - چل۔ بھاگ"

شکیل بھائی نے سمجھایا نا — بری بات گالی نہیں دیتے —" مگر صبیحی کے چلے جانے کے بعد ان کو بھی سکون ہوا۔ اور پھر ہنسی مذاق اور ہنگامہ شروع ہو گیا۔

صبیحی کسی ملازمہ یا نوکر کی لڑکی نہیں تھی بلکہ بڑے پاپا کی سگی بھانجی تھی اس کے باپ لڑائی پر گئے تھے۔ جہاں سے مفقود الخبر ہو گئے اور ماں اس گھر میں بچوں کا گوموت دھونے اور برتن مانجھنے اور جھاڑو لگانے میں چل بسی۔ مرتے مرتے بھی ستم ظریفی یہ کی کہ اپنی چھ سات برس کی بچی صبیحی کو یونہی چھوڑ گئی اور اس لئے اب صبیحی اس گھرانے میں اچھوت بنی ہوئی تھی۔ اس کا زیادہ تر وقت بچوں کو کھلانے میں گزرتا جب دیکھو کسی نہ کسی موٹے تازے بچے کو سنبھالے ہوئے دوہری ہوئی جا رہی ہے مگر وہ خود بھی بڑی ڈھیٹ اور بے حیا کہ خود ہر جگہ بچوں میں گھستی پھرتی تھی اور نتیجہ میں مار بھی کھاتی تھی اور گالیاں بھی سنتی تھی۔

پھر پتہ نہیں حالات نے کیا کروٹ بدلی۔ عجب ہنگامے ہوئے لوگ اپنا جان مال سمیٹ کر بھاگے نہ جانے کون کس سے کہاں بچھڑ گیا۔ اسی نفسی نفسی کے عالم میں صبیحی کو کسی نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا کہ وہ کہاں رہ گئی۔ ان دس گیارہ برسوں میں شکیل بھائی میں کوئی خاص فرق نہ آیا صرف اتنا ہی ہوا کہ وہ تعلیم وغیرہ مکمل کر کے بے فکری کے دن گزار رہے تھے کبھی کبھی ایک آدھ انٹرویو میں بھی کہیں کہیں ہو آیا کرتے تھے۔ مگر ان کے ذہن کے کسی گوشے میں بھی صبیحی کا کوئی دھندلا سا عکس باقی نہیں رہ گیا تھا۔

وہ گالف کلب میں بیٹھے ہوئے تھے۔ حسب معمول تین چار بچوں نے اُن کو گھیر رکھا تھا اور وہ ان سے طرح طرح کے دلچسپ سوال پوچھ رہے تھے۔ اتنے میں اُنہوں نے دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکی تیزی سے گھوڑا دوڑاتی ہوئی آئی۔ کلب کی باؤنڈری کے پاس وہ گھوڑے سے کود کر اتری اور پھر دو ایک منٹ کے وقفے کے بعد درشت لہجے میں پکارا "منجو — منجو — کم ہیر"

ایک لڑکی جو شکیل بھائی کے سگریٹ کیس سے کھیل رہی تھی تیزی سے اٹھ کر بھاگی اس لڑکی نے پھرتی سے منجو کو اٹھا کر گھوڑے پر بٹھایا اور انگریزی میں اس کو ڈانٹا "اجنبیوں کے پاس مت جایا کرو!"

وہ گھوڑا دوڑاتی ہوئی سامنے کی پہاڑیوں میں گم ہو گئی۔

شکیل بھائی کو کچھ عجیب سا لگا۔ ہمیشہ تو یہ ہوتا تھا کہ ان کو بچوں سے دلچسپی لیتے دیکھ کر لوگ خوش ہوتے تھے۔ رنگین تصویریں۔ ٹکٹ۔ چاکلیٹ اور معلومات عامہ کی چھوٹی چھوٹی کتابیں یہ چیزیں ایسی تھیں جن کے ذریعے شکیل بھائی ہمیشہ ہر گھرانے کے بچوں سے اور اُن کے ذریعے اُن کے گھر والوں سے دوستی کر لیتے تھے۔ لیکن آج پہلی مرتبہ ان کو اس طرح ٹوکا گیا تھا۔ کیوں کہ واقعی اگر اس لڑکی کے جملے کا مطلب نکالا جاتا تو یہ ہوتا کہ اُس نے منجو کو نہیں بلکہ شکیل بھائی کو ڈانٹا تھا کہ "خواہ مخواہ اجنبی بچوں کو کیوں خراب کرتے ہو۔"

وہ سوچتے رہے دو تین بچے جو موٹے موٹے اُونی کپڑے اور نوک دار کنٹوپ پہنے ہوئے گڈے ایسے لگ رہے تھے ۔ ان کو خاموش دیکھ کر وہاں سے چل دیئے ۔ کلب کے استقبالیہ ہال میں بچوں نے شور مچانا شروع کر دیا ۔ ان کی میاں اور ڈیڈی بیٹھے بیئر پینے اور تاش کھیلنے میں مصروف تھے ۔ کچھ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں گالف کورس میں گھوڑ سواری میں مشغول تھیں انہیں اکثر کبھی کبھی وہ اسمارٹ لڑکی بھی دکھائی دیتی جس نے منجو کو ڈانٹ کر بلایا تھا شکیل بھائی بور ہو کر اکیلے ان پہاڑوں کی طرف چل دیئے جن کی چوٹیوں پر ڈھلی ہوئی چاندی کی طرح برف چمک رہی تھی ۔ ہوٹل کے ڈائننگ روم کی طرف چلتے ہوئے انہوں نے ایکبار پھر اس لڑکی کو پنے پاس سے گھوڑے پر گزرتے دیکھا ۔ ابکی اُس لڑکی نے بھی انکو بغور دیکھا اور عجیب طنزیہ انداز میں منھ بناتی آگے بڑھ گئی ۔

شکیل بھائی برابر اس کے بارے میں سوچتے رہے ۔

دوسرے دن رات کے کھانے کے بعد ہوٹل کے ہال ہی میں وائلن کا ایک پروگرام تھا ۔ وائلن کا ایک مشہور مغربی ماہر اپنے کمال کا مظاہرہ کرنیوالا تھا ۔ اس لئے پورا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا ۔ شکیل بھائی بھی اپنے جاننے والوں کے ساتھ وہاں موجود تھے ۔ اس چھوٹے سے خوبصورت پہاڑی شہر میں ہوٹل سے اچھی سوسائٹی اور کہیں نہیں تھی اور یہاں کے تقریباً ہر شخص سے شکیل بھائی واقفیت پیدا کر چکے تھے ۔

تھوڑی دیر میں انہوں نے دیکھا کہ وہی لڑکی منجو کو ساتھ لئے ایک معمر یورپین کے ہمراہ آ رہی ہے ۔ وہ تینوں آ کر شکیل بھائی کے برابر ہی صوفے پر بیٹھ گئے وہ لڑکی شکیل بھائی کو اور شکیل بھائی اُسکو ایک دوسرے کی نظر بچا کر دیکھتے رہے شکیل بھائی کے رسم و راہ پیدا کرنے کا ایک ہی پاسپورٹ تھا کہ بچوں سے گھل مل جانا مگر منجو ایک مرتبہ ڈانٹ کھا چکی تھی لہٰذا اب کی دفعہ کئی بار کے اشارے کے باوجود وہ انکے پاس نہ آئی ۔

پروگرام شروع ہونے سے قبل ایک بہت ہی اسمارٹ نوجوان نے جو کسی ریاست کے گورنر کا اے ، ڈی ، سی تھا اعلان کیا کہ پروگرام کی منتظم مس صبیحہ انعام الرحمن تعارفی تقریر کریں گی ۔

جو لڑکی اس وقت شکیل بھائی کے لئے ذہنی اُلجھن کا سبب بنی ہوئی تھی بہت ہی تکلف سے اُٹھ کر اپنا مغربی لباس سنبھالتی ہوئی ڈائس پر پہونچی اس نے انتہائی مہذب اور شائستہ انداز سے انگریزی میں وائلن کے ماہر کا تعارف حاضرین سے کرایا اور پانچ ہی چھ منٹ بعد بڑے وقار کے ساتھ تالیوں کی گونج میں اپنی جگہ واپس آ کر بیٹھ گئی ۔

پروگرام کیسا رہا ۔ شکیل بھائی کو نہیں معلوم ۔ لیکن ان کو یہ ضرور معلوم رہا کہ اس پورے عرصہ میں صبیحہ نے کتنی بار پہلو بدلا اور کتنی بار اپنے تراشیدہ بالوں کو جھٹکا دیکر سنبھالا ۔

دوسرے دن شکیل بھائی نے یہ کیا کہ صبیحہ انعام الرحمن کے بارے میں تمام معلومات فراہم کیں ۔ ان کو پتہ چلا کہ وہ اس معمر انگریز کی جو کسی ہائی کورٹ کا ریٹائرڈ جج ہے وارڈ ہے ۔ صبیحہ دہلی کی ہے جہاں کے خود شکیل بھائی بھی ہیں ۔ اور یہ کہ صبیحہ کی تمام تعلیم و تربیت اسی انگریز نے مسوری کے انگریزی اسکولوں میں کرائی ہے اور ابھی حال ہی میں سینیئر کیمبرج پاس کر کے صبیحہ آج کل گلمرگ آئی ہوئی ہے ۔

یہ تفصیل شکیل بھائی کو خاصی دلچسپ معلوم ہوئی انہوں نے اپنی فطری دلکشی اور آداب و اخلاق سے پوری واقفیت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اس ریٹائرڈ جج سے رسم و راہ پیدا کی جسنے ان کو خاصی بے تکلفی کے بعد صبیحہ کے بارے میں اتنا اور بتایا کہ اُسنے صبیحہ کو دہلی کی سڑکوں پر روتا ہوا پایا تھا اور اٹھا کر اپنے گھر لے گیا اس بچی کی آمد سے اس کی تنہائی ختم ہو گئی اور اب اس نے اس کو اپنی لڑکی بنا لیا ہے ۔

شکیل بھائی کی ذہنی کشمکش ختم نہ ہوئی وہ صبیحہ سے بری طرح متاثر ہوئے تھے اور اس سے ملاقات و رسم و راہ پیدا کرنے کے بہانے ڈھونڈ رہے تھے ۔ ایک دن انہوں نے کلب میں منجو کو قصداً پکڑ لیا ۔ منجو بمبئی کے ایک سندھی تاجر کی لڑکی تھی اور صبیحہ سے بہت ہلی ہوئی تھی ۔ وہ اس کو بڑی دیر تک چپکاتے

چیونگ گم اور رنگین تصویریں وغیرہ دے کر بہلاتے رہے۔ ان کی اُمید کے مطابق اس وقت صبیحہ وہاں پہونچی۔ وہ اس وقت شلوار سوٹ پہنے ہوئے تھی اور گھوڑا دوڑانے کی وجہ سے پسینے میں نہائی ہوئی تھی۔ چسٹر اس نے اُتار کر ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ اس نے ایک منٹ منجو کو شکیل بھائی کے پاس دیکھا اور پھولی ہوئی سانسوں کو قابو میں کرتے ہوئے درشت لہجے میں کہا "منجو"

منجو ڈر گئی۔ مگر شکیل بھائی فوراً اخلاق سے بولے۔ "رہنے دیجئے بچہ ہے۔ ڈانٹنے سے ڈر جائے گی"

صبیحہ نے ماتھے پر تیوریاں ڈال کر شکیل بھائی کو دیکھا اور منجو کا جو آکر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی تھی سر سہلانے لگی۔

"معاف کیجئے مجھے اصل میں بچوں سے بہت محبت ہے۔ اسی لئے میں جہاں کہیں بھی ننھے منے بچوں کو دیکھتا ہوں بے اختیار ہو کر اُن کی طرف کھنچ جاتا ہوں" ۔ شکیل بھائی نے بڑے پُرتکلف انداز میں اس طرح معذرت پیش کی کہ صبیحہ پر کوئی خوشگوار اثر پڑ سکے۔

صبیحہ بہت بےنیازی سے بولی "مگر محبت کرنے کے لئے صرف گاف کلب اور نیڈو ز ہوٹل کے ہی بچے نہیں ہیں۔ وہاں وادیوں میں ننھے ننھے بچے کیچڑ اور مٹی میں لت پت کھیل رہے ہیں، جائیے اُن سے بھی کبھی اظہار شفقت کیجئے"

معاف کیجئے محترمہ آپ غلط سمجھیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ بچے بہرحال خدا کی نعمت ہیں ان سے وہ جہاں کہیں بھی ہوں اور جس حال میں بھی ہوں، محبت و شفقت کا اظہار کرنا چاہئے خود ہمارے ......

رہنے دیجئے شکیل بھائی اس بناوٹ کو ۔"

شکیل بھائی چونک پڑے۔ اُن کا ذہن زد سے چکرا گیا : غیر شعوری مگر فوری طور پر انہوں نے صبیحہ کے ماتھے پر بائیں طرف ہلکا سا ہلال نما نشان دیکھا۔ وہی جو اس گھناؤنی لڑکی صبی کے ماتھے پر تھا ...... اب وہ سب کچھ سمجھ چکے تھے۔

"مجھے معاف کر دو صبی ...... اصل میں بات یہ ہے کہ ....

"شکیل بھائی ــ وہ دن میں کبھی بھی نہیں بھولوں گی جب آپ نے انتہائی نفرت و حقارت سے مجھ کو دیکھا تھا۔ حالانکہ میں نے تو آپ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ رہی تھی ــ"

باقی جتنے دن شکیل بھائی گلمرگ میں رہے ان کو تنہا ہی دیکھا گیا۔ شاید ان کو اب خوبصورت صاف ستھرے اور امیر بچوں سے بھی محبت نہیں رہ گئی تھی۔ بلکہ اب تو وہ خود میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے اور شیو بڑھائے ہوئے گھوما کرتے ہیں۔

عقیلہ عطاءاللہ

کیا تھی وہ بات؟

برف کے چھوٹے چھوٹے گالے بارش کی سی تیزی کے ساتھ گدلے آسمان سے گر رہے تھے، درختوں کے ٹنڈ منڈ برہنہ شاخوں پر روئی کے گالے سے چپکتے جا رہے تھے، چیل کے سدا بہار درختوں کی سبزی بھی برف کی سفیدی میں گم ہو چلی تھی۔

بند کمرے میں آتشدان کی دہکتی ہوئی آگ کے علاوہ دو انگیٹھیاں بھی سلگ رہی تھیں، سب لوگ ڈ دو تین ٹولیاں بنائے کسی نہ کسی مشغلے میں سر کھپا رہے تھے، ارشد، حمید تاش کھیل رہے تھے ہر بازی کے اختتام پر اُن کی آوازیں بلند ہو جاتیں، وہ کھیلتے کھیلتے ایک دوسرے پر بے ایمانی کا الزام لگاتے مرنے مارنے کی دھمکیاں دینے اور پھر کھیلنے لگتے ہیں۔ اُن کے قریب بیٹھی ہوئی نگہت بہت ہی دلچسپی سے اُن کا کھیل دیکھنے میں محو تھی۔ انجم کے ہاتھ میں برش تھا وہ سامنے بیٹھی ہوئی ناہید کی ایک بہت ہی خوبصورت تصویر بنا رہے تھے، تھوڑی دیر بعد وہ رکتے — ناہید کو آنکھ مارتے اور سگریٹ کا ایک لمبا کش لیکر سارا دھواں اسپر چھوڑ دیتے، وہ جھلا کر کھڑی ہو جاتی۔

"میں اب نہیں بیٹھوں گی، دیکھئے نا بڑے ابا یہ ....۔" اور وہ ہزار کوشش کے باوجود انجم کی شوخ آنکھوں کی بابت کچھ نہ کہہ سکتی تھی اور کھڑی منہ بنائے انھیں گھورتی رہتی۔

"لے بس تھوڑی دیر اور۔" انجم اس کا ہاتھ پکڑ لیتے۔ "دیکھو نا قسم سے، ساری محنت بیکار جائے گی۔" نانی جی اس وقت بول پڑتیں۔ "توبہ ہے ایک تھوڑی دیر بیٹھ بھی نہیں سکتی۔" اور جب ناہید جھنجلا کر پھر سے بیٹھ جاتی تو وہ منہ پھیر کر ہنسنے لگتیں۔ انجم اپنی پھیلی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ ہونٹوں پر اُنگلی رکھتے۔ "اچھا اب ایسی حرکت نہ ہو گی .... تھوڑی دیر اور۔" کونے والے صوفے پر مسعود بڑے انہماک سے وائلن کے تار ٹھیک کر رہا تھا کبھی کبھی وہ یونہی تاروں پر انگلیاں پھیرتا تو اس کی طرح کوئی اُداس اُداس سا نغمہ کمرے میں بکھر جاتا۔ خان اعظم اپنی ایک دو نالی بندوق کا معائنہ فرما رہے تھے۔ چوڑے سے ایک طشت میں مٹی کا تیل تھا اور اس میں بندوق کے چھوٹے بڑے پُرزے پڑے ہوئے تھے، قریب ہی دو رائفلیں اور پڑی ہوئی تھیں جنھیں کریم بخش انکی ہدایت کے مطابق صاف کر رہا تھا۔ ان سے فاصلے پر بیٹھے ستون کا سہارا لئے گرم دوشالے میں لپٹی فاروق بیٹھی، راہیڈر ہیگرڈ کے ناول "SHE" کا آخری صفحہ پڑھ رہی تھی۔ خاور سب سے الگ تھلگ اپنے بستر میں دبکا پڑا تھا وہ کبھی فاروق کو دیکھتا اور کبھی ایک اچٹتی نظر باقی لوگوں پر ڈالکر کچھ سوچنے لگتا تھا، اس کے فراخ ماتھے پر فکر کی لکیریں نمایاں تھیں، آخر وہ اُٹھا آہستہ آہستہ چلتا ہوا فاروق کے بالکل سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا، اسوقت وہ بہت ہی سنجیدہ تھا، فاروق نے ایک جھٹکے سے کتاب بند کر دی اور اسے اپنی جانب اتنی حیرت سے تکتے دیکھ کر ہنس پڑی، لیکن فوراً ہی اس کی پیشانی پر چند لکیریں اُبھر آئیں جو سراسر معنوی تھیں۔

"کیوں ...... کیا کوئی نئی شرارت ؟؟؟ پڑھنے نہیں دوگے ؟"

"نہیں جی آپ پڑھیئے میں دراصل ایک بات پر غور کر رہا تھا۔"

"کیا تھی وہ بات ؟ .... لیکن میں سچ کہتی ہوں خاور اگر کوئی گڑبڑ کی تو چانٹا مار دونگی۔"

"چانٹوں اور گھونسوں کے بارے میں بڑے ابا کا خیال ہے کہ ان سے ہڈیاں مضبوط ہوجاتی ہیں۔" بڑی ہی شریر مسکراہٹ اُسکے خوبصورت چہرے پر پھیل گئی۔

"میں اس وقت بکواس سننے کے موڈ میں نہیں .... کیا کہہ رہے تھے تم ؟؟؟"

"کچھ نہیں سوچ رہا تھا کہ ...... لیکن ہٹایئے آپ خفا ہوجائیں گی حالانکہ سیدھی سی بات ہے۔"

"سیدھی سی بات پر میں خفا نہیں ہوا کرتی، کہہ ڈالو !"

"جی، کل آپ سب لوگ باہر دالان میں تھے، اسی ستون کے سہارے انجم بھیا اور بھابی ناہید کھڑے باتیں کر رہے تھے، انجم بھیا نے بھابی ناہید کی ٹھوڑی اُوپر اٹھائی اور نہ جانے کیا کہا کہ ناہید بھابی نے شرما کر منہ پھیر لیا۔"

"اس سے آپ کا کیا تعلق ؟؟؟" فاروق نے تیزی سے کہا۔ "یہی کچھ سنانے چلے تھے آپ ؟؟؟"

"جی نہیں، میں سوچ رہا تھا کہ میں بھی آپ کی ٹھوڑی پکڑ کر کچھ کہوں تو .... ! میرا مطلب ہے کہ آپ بھی اسی پیارے انداز میں مسکرا کر منہ پھیر لیں گی یا آپ کا ہاتھ چل جائیگا۔"

"تجربہ شرط ہے۔" فاروق نے خلاف توقع بہت ہی سنجیدگی سے کہا۔

"لیکن سوال یہ ہے کہ آپ ایسا کریں گے کیوں ؟"

"بس یونہی جی چاہتا ہے .... میں آپ کے بارے میں بہت کچھ سوچا کرتا ہوں، پہلے انجم بھیا اور ناہید بھابی کے بارے میں سوچا کرتا تھا انھیں آپس میں لڑتے جھگڑتے، ہنستے کھیلتے دیکھ کر مجھے بیحد خوشی ہوتی تھی، لیکن جب سے ان کی شادی ہوئی ہے انھوں نے گویا مجھ سے قطع تعلق کر لیا ہے ...... میں بھی انھیں لفٹ نہیں دیتا۔"

"بڑا احسان کر رہے ہیں آپ اُن پر، اور اس سے زیادہ مجھ پر کہ میرے بارے میں بہت کچھ سوچا کرتے ہیں۔"

"آپ مذاق سمجھ رہی ہیں ...... تائی حور نے بھی میری باتوں کو سنا ان سُنا کر دیا، میں لڑ پڑونگا اُن سے۔"

"امی کو کیوں پریشان کیا تھا آپ نے۔" فاروق کے لہجے میں بلا کا طنز اور جھلاہٹ تھی۔

دراصل فاروقی آپا، آپ مجھے بے حد اچھی لگتی ہیں اور ...... میں چاہتا ہوں کہ آپ سے شادی کر لوں۔"

"ہائیں" فاروق اُچھل پڑی۔ "تم شادی کروگے مجھ سے ! بیوقوف، بدتمیز کہیں کے۔"

"اوہ سُنئے تو ......" وہ بوکھلا گیا۔ "آپ ظاہر ہے کسی نہ کسی سے شادی کریں گی، کیوں نہ مجھ ...."

"چپ رہو خاور ...... اب میں کوئی بات نہیں سنونگی، بدتمیز۔"

"آپ نہیں سُنیں گی، بڑے ابا نہیں سنیں گے، تائی حور نہیں سنیں گی، تو پھر کون سنے گا ؟؟" اس کے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔ اس نے کچھ اور کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ قہقہوں کی آواز سنکر جو اچانک کمرے میں گونج اُٹھے تھے وہ گھبرا گیا، سب کا رُخ اُنہی کی طرف تھا، وہ منہ بسورتا ہوا اُٹھا

اور ارشاد رحمید کو ٹھکا دکھا کر یونہی بدلہ لینے کی دھمکی دی، خان اعظم تانی حورا سے آنکھیں چرا کر اپنے بستر میں جا دبکا۔ فاروق نے اپنا چہرہ گھٹنوں میں دے لیا اور کوئی نہ دیکھ سکا کہ ایک رنگ اس کے یاقوتی ہونٹوں کے گوشوں سے کانوں کی لو تک پھیل گیا۔

دوسرے دن آسمان پر سورج چمک رہا تھا۔ برفیلی پہاڑیوں پر پھیلی ہوئی تیز چمکیلی دھوپ آنکھوں کو چکا چوند کئے دے رہی تھی، چیل کے درخت منوں برف کے بوجھ کے نیچے دبے ہوئے تھے۔ زمین نے کچھ دیر کے لئے سفید بے داغ دوشیزگی کا لبادہ اوڑھ لیا تھا۔ خان اعظم کی معیت میں یہ چھوٹا سا قافلہ ایک چھوٹی سی پگڈنڈی طے کرتا ہوا۔ اور پر چاندی کی طرح دمکتی ہوئی برفیلی پہاڑی پر جا رہا تھا جس کے دونوں طرف چیل کے جنگل تھے جس میں کہیں کہیں دیودار کے بلند اور خوبصورت درخت بھی تھے۔ یہ سیزن خان اعظم نے کوئٹہ کے بجائے مری میں گذارنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جہاں ان کا ذاتی بنگلہ تھا، خان اعظم کے فیصلے کے بعد انکار کی کس کو مجال ہو سکتی تھی اور پھر تانی حورا کے علاوہ سب ہی کی تمنا تھی کہ یہ سیزن مری میں گزارا جائے۔ چنانچہ خاندان کے سب بچوں کو ساتھ لے کر خان اعظم مری آگئے تھے۔ خاور اور فاروق خان اعظم کے ساتھ سب سے آگے تھے اور باقی لوگ آہستہ آہستہ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹے پیچھے آ رہے تھے۔ ایک بہت ہی تناور لیکن گنجے درخت کے نیچے پہونچ کر خان اعظم نے اپنا تھیلا اور رائفل نیچے رکھدی اور اُن کے اشارے پر کریم بخش نے بیلچے سے ایک مقام کی برف ہٹانی شروع کی اور جب برف کا وہ ڈھیر وہاں سے ہٹ گیا تو سب نے دیکھا کہ وہاں اُن کے سامنے ایک قدرتی غار کا دروازہ نمودار ہو چکا ہے۔

"یہ ہے وہ غار جس کے متعلق نہ جانے کتنے واقعات میں تم کو سُنا چکا ہوں" خان اعظم نے مسکراتے ہوئے سب کو مخاطب کیا، لو آؤ دیکھ لو تمہارے سفر کا مقصد تو پورا ہو جائے۔" غار میں چلتے ہوئے سب نے محسوس کیا کہ سردی کی شدت میں حیرت انگیز طور پر آہستہ آہستہ کمی ہوتی جا رہی ہے اور اس وقت تو سب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں، جب انھوں نے دیکھا کہ پتھر کے ایک نکلے ہوئے ٹکڑے سے ایک رائفل لٹکی ہوئی ہے اور نیچے ایک نوجوان بے خبر پڑا گہری نیند سو رہا ہے، خان اعظم کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "برف سے ڈھکے ہوئے غار میں یہ نوجوان، ہم سمجھے تھے کہ اس قسم کی دلیری ہمارے ہی حصے میں آئی ہے۔" جواب میں تانی اماں نے برا سا منہ بنایا، جیسے اُن کی اس قسم کی دلیری سے انھیں ہمیشہ خدا واسطے کا بیر رہا ہو، اور کریم بخش سے بولیں، "تم تو چلنے کا انتظام کرو .... بچے تھک گئے ہیں، دیکھو تو چہرے سپید ہو رہے ہیں .... دیکھ پائے ان کا مہی بابا کا غار۔"

تانی حورا کے اس طنز پر سب ہی ہنس پڑے۔ لیکن خان اعظم اس ریمارک کی پرواہ کئے بغیر آگے بڑھے اور سوتے ہوئے جوان کو جھنجھوڑ دیا وہ ہڑبڑا کر بیٹھ گیا اور آنکھیں مل مل کے انھیں دیکھنے لگا۔

"تم خواب نہیں دیکھ رہے دوست۔" انجم نے کہا

"جی ہاں اور حقیقت میں ہم انسان ہی ہیں .... آپ کی طرح۔" خاور نے لقمہ دیا۔ اس نے باری باری سے سب پر نظر ڈالی اور اوپر لٹکی ہوئی رائفل دیکھنے لگا۔

"ارے! ارے! ایسے .... ہم ڈاکو نہیں ہیں .... قسم خدا کی آپ غلط سمجھے۔" خاور پیچھے ہٹتے ہوئے بولا، جیسے وہ اسے گولی ہی مار دیگا، سب کھلکھلا کر ہنس پڑے، جوان بھی مسکرا پڑا، وہ ایک خوبصورت اور وجیہ شخصیت رکھتا تھا۔ گورا رنگ دلکش خدوخال، چوڑی پیشانی، بڑی بڑی نشیلی مسکراتی ہوئی آنکھوں کا مالک شکاری لباس میں وہ بہت ہینڈسم لگ رہا تھا، چلتے چلتے تانی حورا کرید کرید کر اسکے اور اس کے خاندان کے متعلق سوالات پوچھتی رہیں لیکن وہ انتہائی خندہ پیشانی مستقل مزاجی اور ادب سے ان کے سوالوں کے جواب دیتا رہا

اُس نے بتایا کہ اس کا نام بدر ہے شمس آباد کے بہت بڑے جاگیردار کا اکلوتا لڑکا ہے۔ بی۔اے تک تعلیم پائی ہے، بیرونِ ممالک میں تعطیلیں گزارنی پڑتی ہیں وہ اسے بہت ہی پیاری ہیں۔ مدتوں گھر سے غیر حاضر رہتا ہے۔ مستقل کوئی آوارہ ساتھی نہیں ملتا اس لئے اکیلے ہی گھومتا ہے۔

"بھئی واقعی تم بہت دلچسپ آدمی ہو۔" خان اعظم نے اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تمہاری زبانی میں اپنے ہی واقعات سن رہا ہوں۔" تائی حور نے منہ بنا کر سر کو خفیف سی جنبش دی اور سر تک کے پار دیکھنے لگیں۔ بہرحال بدر کو وہ بھی پسند کرنے لگیں جیسے خان اعظم کی طرح۔

اور وہ رات انہوں نے غار ہی میں اودھم مچاتے گزاری، عادر نے مختلف جانوروں کی بولیوں کی نقل کی، سہگل کے گیت راک اینڈ رول کی طرز پہ سنانے، اکریم بخش کو ساتھ لیکر بھنگڑا اور ٹاپ کا ڈانس ناچا۔ مسعود نے اپنے وائلن پر بڑے ہی اُداس اُداس اور غمگین گیت بجائے (نہ جانے اتنی اُداسی اس کی روح میں کیسے رچ گئی تھی جو وہ آس پاس والوں کو بے نیاز نہ بانٹتا نہ تھکتا تھا!) بدر سے بھی کچھ سنانے کی فرمائش کی گئی، اس نے کچھ تامل کے بعد پنکج ملک کا ایک گیت سنایا۔ "یہ راتیں یہ موسم یہ ہنسنا ہنسانا"

اس کی آواز بڑی پیاری تھی بالکل اسی طرح، آواز پہ اسے قابو تھا۔ مسکرا کر اس نے گیت پورا کیا۔ فاروق سے فرمائش کی گئی مگر طبیعت ٹھیک نہ ہونے کا بہانہ بنا کر وہ ٹال گئی۔

رات کافی کوشش اور پہاڑیوں پر آوارہ گردی کرنے کے بعد بھی خان اعظم اور اُن کے دونوں ساتھیوں، انجم اور بدر کو کوئی شکار نہ مل سکا۔

صبح ہوتے ہی وہ سب بنگلے پر لوٹ آئے ناشتہ وغیرہ کر کے سب اپنے مشغلوں میں لگ گئے۔ رات ہی رات میں موسم بدل گیا تھا۔ برف کا طوفان آنے کے آثار تھے۔ ہلکی ہلکی برف سفید دھول کی مانند فضا میں اُڑ رہی تھی۔ تائی حور اکریم بخش کی مدد سے دوپہر کے کھانے کا انتظام کر رہی تھیں۔ ارشد و حمید نے تاش سنبھال لئے تھے۔ خان اعظم کمرے کی ادھ کھلی کھڑکی سے فاصلے کے پیڑوں کی ننھی ننھی ٹہنیوں کو نشانہ بنانے لگے بدر نے بھی اس نشانہ بازی میں ان کا ساتھ دیا، پھر انجم کو ناہید کی تصویر بناتے دیکھ کر وہ ادھر پلٹ پڑا، ناہید پر اس نے ایک گہری نظر ڈالی۔

"بہت اچھے" تصویر پر ایک ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے اُس نے بے تکلفی سے کہا۔

"لیکن بالائی ہونٹ پر جو خفیف سا خم ہے وہ تصویر میں نظر نہیں آتا۔"

"اوہ" انجم کا ہاتھ رک گیا "آپ بھی باذان گز کے!"

"باذان گز کا تو نہیں ہاں کچھ کچھ۔" ایک دل کش تبسم اس کے ہونٹوں پر پھیل گیا۔

"آئیے" انجم نے دعوت دی۔

"نہ، نہ اسے آپ ہی مکمل کر لیں اسے آپ ہی مکمل کر لیں، میں کوئی دوسری بنا لوں گا۔"

"دوسری ....؟ ضرور ضرور۔" تائی حور دفعتاً بولیں "فاروق کی شکایت اب انجم سے ختم ہو جائے گی۔" مسکراتے ہوئے انھوں نے فاروق کو قریب بلایا۔

اپنے تھیلے سے نکال کر بدر نے مکمل اور نامکمل تصویریں انجم کے سامنے پھیلا دیں اور سب وہاں کھسک آئے، سوائے خاور کے؛ وہ سب کو الگ تھلگ پیروں پر رضائی ڈالے ہتھیلیوں میں سر رکھے بیٹھا تھا۔

"بہت اچھے۔" انجم نے داد دی۔ خان اعظم بھی تصویروں کو پسندیدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

بدر نے سامنے بیٹھی ہوئی فاروق کو سر سے پیر تک دیکھا اور اپنی نیلی آنکھیں اس کے سحر زدہ چہرہ پر گاڑ دیں، ایک لمحہ کے لیے دونوں کی آنکھیں ملیں اور فاروق نے گھبرا کر آنکھیں جھکا لیں۔

"پلیز" اس نے کینوس پر پنسل روک کر التجا کی۔ "نظر اوپر رکھئے۔" فاروق کی نگاہیں اُٹھیں اور پھر جھک گئیں۔ اس کی نظریں آتشدان میں دہکتے ہوئے کوئلوں پر جمی ہوئی تھی، آگ کی تپش آپ ہی آپ بڑھ گئی، کمرہ گرم ہونے لگا اور اس سرد موسم میں بھی اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے اُبھر آئے۔ بدر کا لہجہ حد درجہ نرم اور التجا آمیز تھا، فاروق نے بمشکل نگاہیں اُٹھائیں، بدر نے نگاہ بھر کر اسے دیکھا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں، وہ کچھ کھو سا گیا تھا، فاروق نے اب ہمت کر کے ایک بھرپور نظر اس پر ڈالی، اس کے ہونٹ ہلتے دیکھے اور بہت ہی مدھم بڑبڑاہٹ سنی "ایک شاہکار" وہ وہاں سے کھسک گئی۔

بدر نے آڑھی ترچھی لکیریں کھینچنی شروع کر دیں، وہ بار بار ہاتھ روک کر آنکھیں بند کر لیتا اور پھر لکیریں گہری ہوتی جاتیں۔

"فاروق آپا .... ایک بات!" خاور نے مداخلت کی۔

"نہیں ابھی نہیں" نگہت تنک کر بولی، وہ فاروق کی پارٹنر شپ میں ارشد حمید سے فلیش کھیل رہی تھی۔

"آپ کو کون پوچھتا ہے .... میں فاروق آپا سے مخاطب ہوں۔" خاور نے رکھائی سے جواب دیا۔

"کیا ہے .... بولو تو۔" فاروق نے اس کی طرف دیکھے بغیر پتوں پر نظریں جمائے کہا۔

"ایسے نہیں .... اُٹھ جائیے آپ۔" فاروق نے پتے پٹخ دیئے اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"جاہل" نگہت دہاڑی "اور ان بی صاحبہ کی ذہنیت دیکھئے توبہ ....۔"

"اُونہہ" خاور نے منہ چڑا دیا اور جواب میں نگہت نے ہاتھ کے پتے اس کی طرف کھینچ مارے، ارشد اور حمید نے کھا جانے والی نظروں سے اُسے گھورا۔

"نالائق ہو تم خاور .... خواہ مخواہ ہر کسی سے لڑتے رہتے ہو۔" فاروق نے آتشدان کی طرف بڑھتے ہوئے کہا اور صوفہ گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

"چھوڑیئے" اس نے صوفے کی پشت کا سہارا لیا۔ "آپ مجھے کیا سمجھتی ہیں؟"

"کچھ بھی تو نہیں .... کام کی بات کرو۔"

"میں آپ سے پوچھتا ہوں ....۔"

"مس فاروق" بدر کی آواز نے اس کی بات کاٹ دی۔

"میں آپ کے دو منٹ لوں گا۔"

"میں ابھی آئی خاور۔" فاروق اُٹھتے ہوئے بولی اور خاور بے بسی سے اُسے بدر کے سامنے اسٹول پر بیٹھا دیکھتا رہا۔

تصویر کشی معمولی چیز نہیں اور پھر ایسی تصویر جسے شاہکار بنانا ہو، اس کے لئے یہ تین دن کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ بدر نے دن کے علاوہ اب رات کا کچھ حصہ بھی اس کام کے لیے وقف کر دیا تھا۔

"اب آپ سوجائیے مس خان . . . . . . رات ڈھل رہی ہے۔"

کینوس پر اس نے برش روک دیا۔ اور اپنی سوئی ہوئی آنکھیں فاروق کے چہرے پر گاڑ دیں۔

"میری فکر نہ کیجئے۔" فاروق کی لمبی پلکیں جھپکیں۔ "مجھے نیند آتی ہے تو پھر کسی کو کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی . . . . . . مگر مجھے افسوس کہ امی کی وجہ سے آپ کو بیکار زحمت اُٹھانی پڑی۔"

"تکلیفوں سے مجھے پیار ہے۔" بدر مسکرایا۔ "تائی حورا" وہ آہستہ سے بولا۔ "خدا انھیں سلامت رکھے۔"

"بس کیجئے، آپ تھک گئے ہوں گے۔" فاروق نے پھر کہا۔

"میں تھکا نہیں کرتا، تصویر کشی میرا محبوب مشغلہ ہے۔ لیکن اس کے بعد میں کوئی تصویر نہیں بناؤں گا۔" وہ رکا چند لمحوں کے لیے فاروق کی آنکھوں میں جھانکا۔ "ایسی حسین تصویر کے بعد دوسرا ایسا اچھا ماڈل مجھے کاہے کو ملے گا۔"

"آپ . . . . آپ۔" فاروق کے گال تمتما اُٹھے۔

"میں غلط بیانی سے کام نہیں لیتا . . . . گستاخ آپ مجھے کہہ لیجئے۔"

"باتیں خاصی کر لیتے ہیں آپ۔" فاروق نے جھینپے جھینپے لہجے میں کہا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"سنئے خفا ہوگئیں . . . . میرا مطلب آپ کی دل شکنی نہ تھا مجھے افسوس ہے۔"

"آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔"

"تصویر قریب قریب مکمل ہو چکی ہے، میں چاہتا ہوں اسے آج ہی مکمل کر لوں . . . . . اُمید ہے تھوڑی زحمت آپ اور اٹھا لیں گی۔"

دوسری صبح فاروق کی ایک بہت ہی حسین تصویر سب کے سامنے تھی، انجم نے دل کھول کر بدر کو اس فن پارے کی تکمیل پر داد دی خالق بہت مسرور تھی البتہ ایک خاور ہی ایسا تھا جس نے تصویر کو نگاہ بھر کر بھی نہ دیکھا تھا، اس کا منہ چڑھا ہوا تھا۔ ناشتہ کی میز سے جب سب اٹھ گئے تو وہ فاروق کے قریب آیا۔

"میں! فاروق آپا آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"کہو . . . . . لیکن خاور تم نے میری تصویر دیکھی . . . . دیکھو کیا چیز ہے۔" وہ شوخی سے بولی۔

"میں آپ کی تصویر تمام رات دیکھتا رہا ہوں۔" وہ جل کر بولا۔

"رات مجھے نیند نہیں آئی۔"

"چچ چچ چچ . . . . . . بُری بات ہے . . . . تم ہمارے پاس آ کر کیوں نہ بیٹھ گئے۔"

"آپ مجھے بچہ سمجھتی ہیں حالاں کہ میری عمر اس وقت اٹھارہ برس کی ہے۔"

وہ تیزی سے بولا۔ "مجھے آپ سے سخت شکایت ہے، آپ نے میرا دل توڑ دیا ہے، آپ بدر کی آنکھوں میں بس گئی ہیں۔"

"خاور . . . ."

"مجھے کہنے دیجئے فاروق آپا . . . . مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے بدر آپ کو ہم سے چھین لے گا، اس نے آپ کی تصویر نہیں بنائی بلکہ آپ کو اپنی آڑھی ترچھی لکیروں میں قید کر لیا ہے۔"

"پگلے .... آہستہ بولو" وہ بیزاری سے بولی۔ "تمہاری باتیں سُنکر کون تمہیں ہوشمند خیال کریگا۔"

مجھے کسی کی پرواہ نہیں ...... میں ......" مگر تائی جان کی آواز نے اس کی بات کاٹ دی، انھوں نے حیرت سے دیکھا، بادر اپنے تھیلے اور الفل کو کندھے پر لٹکائے جانے کے لئے تیار ہے۔

"[illegible] آپ جا رہے ہیں ؟ ؟ ؟" فاروق مایوسی سے بولی اور دنیا جہاں کے سناٹے اس کی آنکھوں میں سمٹ آئے تھے "مگر ایسے اچانک کیوں؟"

"ہم جا رہی ہے [illegible]" اس کی دلکش مسکراہٹ میں جانے کیوں ہلکی سی اُداسی رچ گئی تھی۔

"[illegible] کہتے ہیں پھر آئیں گا" تائی جان بولیں "مگر کون جانے ہم انہیں یہاں ملیں بھی یا نہیں ...... اور ہاں اگلی دفعہ یہ اپنی بیوی کو [illegible] لائیں گے"

"بیوی کو ؟ ؟ ؟ [illegible] بوکھلا گیا اور ایک چیخ نے فاروق کے حلق میں گھٹ کر دم توڑ دیا۔

[illegible] کو الوداع کہنے سب ہی اس کے ساتھ بنگلے کے باہر سڑک تک گئے، لیکن فاروق اور خاور اسی جگہ گم سم کھڑے رہے۔

"فاروق آپا ...... " جذبات سے مغلوب ہو کر خاور نے پکارا۔ فاروق نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بڑھی اور خاور کو گلے سے لگا لیا، [illegible] آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"کاش ...... کاش فاروق آپا میں آپ سے ایک سال ہی بڑا ہوتا ...... صرف ایک سال !"

[illegible] بہت ہی اُداس مسکراہٹ فاروق کے ہونٹوں پر پھیل گئی اور اس نے اپنی تصویر دہکتے ہوئے آتشدان میں ڈالدی۔

نشیان

یاں وہی ہے جو اعتبار کیا

تبصرے کے لیے صرف ایک جلد ارسال کریں

نغمۂ حسرت

اس وقت شفقت کاظمی صاحب کا دوسرا مجموعۂ کلام نغمۂ حسرت ہمارے سامنے ہے۔ شفقت کاظمی صاحب ہمارے دور کے اُن شاعروں میں شامل ہیں جو نام و نمود کی دنیا، نمائش، ادبی گروہ بندی اور معاصرانہ کینہ پروری سے بہت دور گوشہ عافیت میں بیٹھے ہوئے زبان و ادب کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ مگر ان کی یہ گوشہ نشینی گمنامی کے ہم معنی نہیں۔ اُن کی غزلیں ہند و پاک کے سخن شناسوں اور نقادوں سے پوری داد حاصل کر چکی ہیں ان کے پہلے مجموعۂ کلام حسرت کدہ کا بھی ادبی حلقوں میں شاندار خیر مقدم کیا جا چکا ہے۔ مولانا حسرت کے حلقۂ تلامذہ میں وہ سب سے زیادہ نمایاں اور ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے اپنی غزل میں مولانا حسرت کی روایت کو نہ صرف باقی رکھا ہے بلکہ اس روایت میں خود اپنی شخصیت کا انداز شامل کر کے اسے ایک مانوس مگر نئی کیفیت بھی بخشی ہے۔ انھیں اپنے اُستاد سے جو والہانہ عقیدت و محبت ہے اس کی مثال اس عہد میں مشکل ہی سے مل سکے گی۔ وہ اپنے نام کے ساتھ جس خلوص اور عقیدت سے "خاک پائے حسرت موہانی" لکھتے ہیں اس سے قاری کے دل میں بڑا ہی مہذب اور خوشگوار احساس پیدا ہوتا ہے۔ پھر بھی یہ روایتیں کچھ ایسی لطیف اور دلنشین ہیں جنھیں اس خالص مادی دور کی محض تن پرور، کھردری اور بے کیف زندگی میں بہ صورت زندہ رہنا چاہیے۔ انہوں نے اپنے عزیز اُستاد کی شخصیت کے سہارے اپنی شخصیت کا اشتہار نہیں دیا۔ بلکہ اُسے تعمیر کیا ہے۔ اُن کی شاعری نیازمندی کی تخلیقی حیثیت رکھتی ہے۔

نغمۂ حسرت کے شروع میں اشارات ـــ نغمۂ حسرت اور پیش لفظ کے تعارفی اور تقریظی عنوانات کے تحت آل احمد سرور، حضرت جوش ملسیانی اور ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اُن کے فنی محاسن پیش کئے ہیں۔ نغمۂ حسرت زبان و بیان کے اعتبار سے ایک خوش لباس و خوش گفتار شاعری کا نمونہ ہے۔ اُن کی شاعری ایک حساس اور درد مند دل کی آواز ہے وہ کیفیت سے متاثر ہو کر ہی اس کا اظہار کرتے ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار سے اُن کی نرم و نازک پُرکیف اور پُرسوز شاعری کا ایک واضح تصور قائم ہوتا ہے۔

اُن سے میرا معاملۂ راز ... کچھ حقیقت تھی کچھ فسانہ تھا
وہ تم میں ... بالآخر کیا ہوگا؟ ... بندگی دور دل ہوئے تو کیا ہوگا؟
ساتھ دنیا کا نہ دیں گے جب تک ... کیسے دنیا میں گزارا ہوگا
شکوہ ہے ... غلط ... میں ہی دنیا سے بے پروا رہا
جیسے برباد ہونے ... اس طرح کوئی رسوا ہوگا

سرسری تجھ سے رہ و رسم تھی اپنی لیکن — نہ ہوئی یہ بھی زمانے کو گوارا اے دوست

ہم زمانے کا ساتھ دے نہ سکے — زندگی وقفِ یادِ یار رہی،

دل بدستور رہے گا بے تاب — نہ بھول جائیں کہ تجھے یاد کریں

تیرے دم تک ہے زندگی اپنی — تجھ سے قسمت نہیں جدا نہ کرے

آلامِ روزگار سے فرصت نہ مل سکی — ہر چند پا گئے ترے غم سے نجات ہم

زمانے کا فسانہ کہتے کہتے، — زمانے میں فسانہ ہو گئے ہم،

کتنے احباب کتنے ہمسائے — ہم کو تجھ سے بچھڑ کے یاد آئے

ختم ہوتا نہیں فسانۂ شوق — عمر گزری ہے مختصر کرتے

فکرِ دنیا میں جی لگا بیٹھے — تیرے احسان ہم بھلا بیٹھے

چھوٹی بحروں کو وہ خوب نباہتے ہیں اور خاص طور پر انھیں میں ان کے دلکش اندازِ بیان کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ انتخاب بہت ہی مختصر ہے —— نغمۂ حسرت میں ایسے اشعار کی کوئی کمی نہیں۔ ہر غزل میں کوئی نہ کوئی چبھتی ہوئی بات کہہ جانا ان کا شیوہ ہے۔ علمی کتب خانہ مظفر گڑھ نے کتابچہ بڑی توجہ سے شائع کیا ہے —— قیمت تین روپیہ ہے۔

ماہنامہ جائزہ

اس وقت ماہنامہ جائزہ کا مارچ کا شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ اس شمارے میں افسانے۔ غزلیات۔ نظمیں۔ گیت اور طنزیہ و مزاحیہ مضامین سب ہی کچھ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ خواتین اور اطفال کے لئے بھی دو حصے مخصوص کئے گئے ہیں۔ افسانوں کے حصے میں کرشن چندر۔ جیلانی بانو۔ حمید کاشمیری۔ رام لعل۔ اور واجدہ تبسم کے افسانے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

کرشن چندر کا افسانہ "اندھیرے کا ساتھی" ایک خانگی المیہ ہے جس کے اختتام میں پھول وتی (افسانہ کا مرکزی کردار) —— مجبوراً بدنام گلی کوچوں کا راستہ اختیار کر لیتی ہے۔ لیکن کرشن چندر یہ بات واضح نہیں کر سکے کہ المیہ کا باعث گردھاری (پھول وتی کے شوہر) کی خرابی و کوتاہ اندیشی ہے یا اس کے باپ کی زر پرستی و بخل۔

حمید کاشمیری کا افسانہ "تیری محفل میں" بڑا دردانگیز افسانہ ہے جس میں معصوم ہیرو کے دل میں بے پناہ جذبات کی آگ مشتعل رہتی ہے، اور آخر کار یہی آگ اس کے وجود کا خاتمہ کر ڈالتی ہے۔ ہیرو کی زندگی بالکل ایک صحرائی درخت کے مانند ہے جو زندگی کے شدائد تنہا ہی برداشت کرتا رہا۔ محسوس ہوتا ہے افسانہ کے آخر میں (melachramatic) کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔

جیلانی بانو کا "پیاسی چڑیا" بے سہارا (woman hood) کی تصویر ہے جس میں ہیروئین شدید جذباتی کشمکش کا شکار رہتی ہے افسانہ اس کی آرزوؤں کے خون سے لبریز ہے۔ بے رفیق ہونے کا احساس اس کے دل میں مختلف نوع کے خیالات کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ جیلانی بانو نے افسانے میں کالج کی زندگی کا بھی بڑے حقیقت پسندانہ انداز میں نقشہ کھینچا ہے۔ اور بہت سے نفسیاتی رموز بیان کئے ہیں۔

واجدہ تبسم کا "تحفہ" ہماری رائے میں اس شمارہ کا سب سے زیادہ دردانگیز افسانہ ہے۔ المیہ مکان کی چار دیواری کے اندر ہی وقوع پذیر ہوتا ہے اور اس کا انکشاف اس وقت ہوتا ہے جبکہ حالات تمام کرداروں کی قدرت سے باہر نکل جاتے ہیں۔ واجدہ تبسم نے ہیروئن کے احساسِ تنہائی کا بیان

بڑے غمناک طور سے کیا ہے۔ "تحفہ" پڑھ کر انگریزی خاتون افسانہ نگار شارلٹ برانٹے (Charlotte Bronte) کے ناولوں کے ماحول کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

طنزیہ و مزاحیہ مضامین میں کنہیا لال کپور، ممتاز مفتی اور اسٹیفن لیکاک (مترجم عثمان غنی) کے مضامین شامل ہیں۔ کنہیا لال کے مضمون میں انکے اور مضامین کی طرح وہی تیکھا پن موجود ہے۔ انھوں نے فتنہ انگیز اور سازشی ذہنیت رکھنے والے افراد کی چالوں کو بڑے دل چسپ طور سے بے نقاب کیا ہے۔

ممتاز مفتی نے انٹلکچول (intellectual) میں اُن حضرات پر طنز کیا ہے جو اپنی انتہائی معمولی لیاقت اور تمام دوسری غیر عقلی حرکات کے مرتکب ہونے کے باوجود دانشور (intellectual) ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں۔ مضمون نہایت دل چسپ ہے۔ اور قہوہ خانوں کی زینت بننے والے نام نہاد دانشور کے لیے ایک آئینہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

لانڈری پرابلم (Laundry Problem) لیکاک کے مضمون کا ایک کامیاب ترجمہ ہے۔ لیکاک ایک کامیاب پروفیسر ہونے کے ساتھ مشہور طنز نگار بھی تھا اور اسے اس فن کی تاریخ میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ اس مضمون میں لیکاک نے اس پیچیدگی کو ظاہر کیا ہے جو اس صنعتی دور کی زندگی کا خاصہ ہے۔ موجودہ زندگی کی پیچیدگیوں کو دیکھ کر عہد گزشتہ کی سادگی کی یاد بعض اوقات ستانے لگتی ہے۔ یہ مضمون لیکاک کا نمائندہ مضمون کہا جا سکتا ہے۔

تنقیدی مضامین میں شاہد احمد صاحب دہلوی کا فیض کی شاعری پر ایک مختصر مضمون شامل ہے۔ جدید نظم کی تاریخ میں فیض کا کیا مقام ہے۔ شاہد صاحب نے اسے بڑی کامیابی کے ساتھ واضح کیا ہے۔

شمارہ میں باقی معلوماتی و دلچسپ مضامین شامل ہیں۔ مدیر نے رسالے کی ترتیب میں بڑے حسن ذوق کا ثبوت دیا ہے۔ رسالہ کا ٹائیٹل سادہ و دلکش ہے۔

البتہ یہ دیکھ کر ذرا بھی تعجب نہیں ہوا کہ اس ضخیم جریدے میں ایک صفحہ بھی کسی علمی عنوان سے مخصوص نہیں، بہرحال یہ کوئی فکر کی بات نہیں اس لئے کہ یہ خیر فرض دوسرے تلخ، ترش لوگ کسی نہ کسی طرح انجام دے رہے ہیں۔

ماہنامہ تہذیب لاہور

خواتین کا یہ خوبصورت اور دیدہ زیب ماہنامہ اپریل سنہ ۶۰ء سے منظر عام پر آیا ہے۔ اسے لاہور کی شاندار صحافیانہ روایات کا ایک بہترین مظہر قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہند و پاک میں خواتین کا یہ غالباً سب سے زیادہ دیدہ زیب مفید اور معیاری رسالہ ہے۔ اصلاح خانہ، شہر کے شب و روز ستاروں کی چال، نعمت خانہ، کشیدہ کاری، ادبی مطالعہ کام کی باتیں، "تہذیب" کے مستقل عنوانات ہیں۔ فیض کے "دو شعر" ناصر کاظمی کی غزل، عصمت بشیر کا "بچے چوری کیوں کرتے ہیں" اور ادبی مطالعہ کے تحت قرۃ العین حیدر کے ناول "آگ کا دریا" پر کمال احمد رضوی کا تبصرہ خاص حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ پہلا شمارہ کمال احمد رضوی کی ادارتی صلاحیتوں کا ایک قابل داد نمونہ ہے، پرچے کو آفسٹ پر چھاپا گیا ہے۔ دو مصور فیچر شامل ہیں۔ اُمید ہے کہ کمال رضوی رسالہ کا یہ معیار کو آئندہ بھی برقرار رکھیں گے۔ جی چاہتا ہے کہ آنے والے شماروں میں ایک مضمون دنیا کی کسی مشہور و ممتاز خاتون کی شخصیت پر ضرور شامل اشاعت ہوا کرے۔

ارباب انشاء

جاں نذرِ دلفریبیِ عنواں کئے ہوئے

شاکر پرشاد تھی - جگراؤں، مشرقی پنجاب

محترم، ایلیا صاحب

خلوص و شوق! — اُردو میں ایسے رسالے کی واقعی اشد ضرورت تھی جو ٹھوس ادبی تخلیقات کے ساتھ ساتھ تاریخی، ثقافتی اور سیاسی موضوعات کا بھی احاطہ کئے ہوں۔ انشاء نے یہ کمی پوری کر دی۔

مارچ کے شمارہ میں "عشتر دیوی" پر آپ کا مضمون قابلِ قدر ہے۔ وہ لوگ جو یونانی دیومالا سے ناآشنا ہیں۔ یقیناً اسے شوق سے پڑھیں گے۔ لیکن ایک بات جو مجھے کھٹکتی ہے وہ یہ کہ مختلف ادوار، ممالک اور تہذیبوں میں عشتر سے وابستہ اس قدر جامع اور وسیع روایات کو آپ نے نہایت اختصار سے پیش کر دیا ہے کہ یہ مقالہ کے بجائے ایک نوٹ بن کر رہ گیا ہے۔ عشتر و تموز کے رومان کا منظوم بابلی قصہ (جو عراق کی کھدائیوں میں ملی تختیوں پر کندہ ہے اور جس کا ترجمہ برٹش میوزیم کے جنرل سمتھ نے کیا ہے) کے کچھ اقتباسات بھی آپ اگر آئندہ شماروں میں پیش کر سکیں تو یہ قارئین کے لئے بے حد دلچسپ ہوگا۔ عشتر کی پاتال سے واپسی کے ذکر کے ساتھ ساتھ عالم گیر ماتم گساری کا ذکر بھی لازمی طور پر ہونا چاہئے تھا۔ بہرحال۔ قدیم بابلی روایات کو سمجھنے کے لئے آپ کا اسلوب قابلِ قدر ہے۔

جدید فارسی ادب سے ہمارا اُردو داں طبقہ بہت کم واقف ہے۔ حسنین کاظمی صاحب کی مساعی اس سلسلے میں بہت اہم ہیں۔ میرا ارادہ ہے جدید فارسی ادب کے شہپاروں کا ہندی میں بھی ترجمہ کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں میں آپکا تعاون چاہوں گا اور موصوف سے بھی خط و کتابت کے ذریعہ مزید واقفیت حاصل کرنا چاہوں گا۔

شیر افضل جعفری - جھنگ شہر

ایلیا بھائی!

آپ کے اداریئے فکر و بصیرت کی ہزار ہا جنتیں لئے ہوتے ہیں۔ رئیس بھائی کو اللہ میاں نے کیا قدرتِ شعر عطا فرمائی ہے۔ بے تکلف لکھتے چلے جاتے ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

حسنین کاظمی صاحب نے کہیں کہیں فروغ کے معاملے میں انشاء کے پڑھنے والوں کو بھی گناہ کا مرتکب فرما گئے ہیں۔ ایک مولوی صاحب تو اس مضمون کو پڑھ لینے کے بعد لاحول کے ساتھ ساتھ سبحان اللہ بھی گنگناتے رہے۔ مجھے فروغ کی شاعری سے زیادہ اس کی تصویر پسند آئی ہے۔ اس کی نامراد آنکھوں سے سلگتی ہوئی انسانیت کا دھواں اُٹھ رہا ہے۔ یہ جلتی بجھتی ہوئی شاعرہ واقعی قابلِ رحم ہے۔ اس کی شاعری کا نفسیاتی تجزیہ سید محمد تقی کے ذمہ ہے۔ دیکھیں وہ کب

اس مقابل فرض سے سبکدوش ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں میرا ایک شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

لغزشیں حسن آدمیت ہیں ✲ میں گناہوں پہ شرمسار نہیں

شمس کنول — بمبئی۔

محترمی!

اس بلاد اپریل کا شمارہ "انشاء" دل و دماغ کے لیے بڑا خوشگوار سامان لایا، سرورق دیکھ کر تو وہ ہیجانی کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کی حکومت مے خانہ اور مسجد دونوں جگہ یکساں ہے۔ پھر آپ کا اداریہ قطعی اپنا ہوتا ہے اور فکر کی دعوت دیتا ہے آپ اپنے اداریہ میں جو بات کہتے ہیں وہ اثر رکھتی ہے۔ اس لئے کہ مدلل ہوتی ہے اور پڑھنے والے کو رشک کے جذبہ میں مبتلا کر جاتی ہے۔ مختار علی کا مضمون "عورت اور مرد" آج کی ایک ضرورت یاد دلاتا ہے اور تعلیم و تربیت کا انداز بدلنے کی جائز سفارش کرتا ہے۔ یقیناً یہ افسوس کی بات ہے کہ مشرق والوں نے ابھی تک جنسیات اور نفسیات کو ایک بنیادی اور ضروری علم نہیں سمجھا اور آج راکٹ کے عہد میں بھی اوہام کے پردے میں بدافعال اور بد چلن بنے گئے ہیں۔ لیکن اے۔ ڈی اظہر کا مقالہ "اردو یا پاکستانی" بھرتی کا مضمون ہے کوئی اُن کو سمجھائے کہ زبان اپنے ملکی نام سے ضرور پہچانی جاتی ہے، مگر یہ شرط لازم نہیں، مصر کی زبان کو مصری نہیں کہا جاتا۔ ایرانی جو زبان بولتے ہیں اس کو ایرانی نہیں کہتے، امریکہ میں بولی جانے والی زبان کو انگریزی ہی کہا جاتا ہے۔ ہالینڈ کے باشندے جو زبان بولتے ہیں اس کو ڈچ کہتے ہیں۔ قدیم ہندو بھارت میں جبکہ خواص کی زبان سنسکرت اور عوام کی زبان پالی تھی۔ مگر ان میں سے کسی زبان کو کبھی بھارتی نہیں کہا گیا۔ گو آج صوبائی یا علاقائی زبانیں ہند و پاک میں موجود ہیں مگر یوپی کی زبان کو کوئی علاقائی نام نہیں دیا گیا۔ اظہر صاحب کی یہ بھی بھول ہے کہ اپنی زبان کو اپنا ملکی نام دینے سے قومی کردار پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ امریکہ کے باشندوں کی اپنی کوئی زبان نہیں اور نہ ان کا کوئی ادبی بیک گراؤنڈ ہے مگر کیا امریکی قوم کو آج غیر ترقی یافتہ اور غیر مہذب کہا جا سکتا ہے۔ اظہر صاحب کو یہ بھی جاننا چاہئے کہ مہاتما گاندھی نے ہندوستان کی زبان کو ہندوستانی نام کسی ملکی یا قومی جذبہ کے تحت نہیں دیا تھا بلکہ اُردو اور ہندی جھگڑے کو ختم کرنے کے لئے درمیان کی راہ اختیار کی تھی اور اگر مسلم لیگ نے اُردو کو مشرف بہ اسلام نہ کیا ہوتا تو ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان کی سرکاری زبان عربی اور دیوناگری رسم خط میں ہندوستانی ہی ہوتی۔ دراصل اب اُردو کو پاکستانی نام دینا اور ایڑی چوٹی کا زور لگا کر طاقت اور وقت ضائع کرنا اسی قسم کا سٹنٹ ہے جو کبھی ہندوستان اور پاکستان میں سڑکوں کے نام بدلنے اور قدیم مجسمے ہٹا کر نئے بت نصب کرنے کے سلسلے میں دیکھا جاتا ہے۔ یہ سراسر جذباتیت ہے اور ایک باشعور نارمل شہری اس جذباتیت کا کبھی شکار نہیں ہوتا — حسنین کاظمی نے بڑی ہمدردی سے خانم فروغ فرخ زادکی ادبی اور ازدواجی زندگی کا خاکہ پیش کیا ہے۔ فروغ کا فن اس حقیقت کو اور واضح کر دیتا ہے کہ آرٹ کا ظہور دراصل ایک FRUSTRATION ہی کا خوشگوار نتیجہ ہوتا ہے۔ بہر نوع کاظمی صاحب نے جس کاوش اور دلچسپی کے ساتھ یہ مضمون لکھا ہے اس کے لئے وہ داد کے مستحق ہیں۔ . . . . امیر علی کی داستان اپنی ہر قسط میں بلا کی سنگین بنتی جاتی ہے۔ اس داستان سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ ہر تحریک (وہ چاہے بابڑی) کامیاب ہو سکتی ہے، بس تنظیم شرط ہے اور تنظیم کے لئے نعرہ تکبیر ہی ضروری نہیں تبے بھوانی بھی کام کی بات ہے۔ شکیل صاحب کے اس ترجمہ میں روانی کافی ہے۔ سید محمد مہدی نے اسٹالن کو آہنی پردہ سے باہر لا کر اُس کا اور اُس کے ساتھیوں کا بڑی خوبی اور غیر جانبداری سے پوسٹ مارٹم کیا ہے۔ جوش ملیح آبادی

کی غزل اچھی ہے۔ گو رئیس امروہوی کی "نوائے وداع" پڑھ کر حسرت موہانی "چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے" گنگناتے ہوئے یاد آجاتے ہیں۔ مگر رئیس کی یہ کوشش بُری نہیں! لیکن آپ کو چاہئے کہ آپ طویل غزلوں، اور نظموں کے انتخاب میں احتیاط سے کام لیں، نفسیات کا تقاضا ہے کہ جنتی نغمے بھی اگر طویل ہوں تو اکتاہٹ کا باعث بن جاتے ہیں!

تنزیل الرحمٰن ایڈووکیٹ ۔ کراچی

جناب جون ایلیا صاحب ــــ سلام مسنون۔

سابقہ شمارہ میں اے۔ ڈی۔ اظہر صاحب کا مضمون پڑھا۔ یہ مضمون غالباً دو تین ماہ قبل میں خود موصوف کی زبانی سُن چکا تھا۔ اور میں نے موصوف سے باصرار عرض کیا تھا کہ اس مضمون کو ضرور چھپنا چاہئے سیاسی ذکی مصالح اپنی جگہ ہیں۔ مگر یہ ایک علمی اور لسانی مسئلہ ہے جس سے قومی ترقی کا گہرا تعلق ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اے۔ ڈی اظہر صاحب نے اس مضمون کی اشاعت کے لئے آپکے پرچہ کا انتخاب کیا اور ساتھ ہی آپ کا اعلان بھی وجہ مسرت ہے کہ آپ دوسرے لوگوں کی آراء کے منتظر ہیں۔

جہاں تک اے۔ ڈی اظہر صاحب کے مضمون میں اُردو سے متعلق نفسیاتی پس منظر کا ذکر ہے اس سے مجھے جزوی طور پر اختلاف ہو سکتا ہے کیونکہ یہ ممکن ہے کہ اظہر صاحب نے چند اصحاب یا کسی حلقۂ ادب کے ارکان سے ملاقات تبادلۂ خیال کے نتیجہ میں یہ رائے قائم کرلی ہو مگر بالکلیہ ایسا کہنا صحیح نہیں ہے۔

لیکن ایک بات جو میرے خیال میں اے۔ ڈی۔ اظہر صاحب کہنا چاہتے ہیں اور کہہ بھی گئے ہیں مگر پھیلا کر وہ ہے یہ کہ "اُردو کا نام پاکستانی ہونا چاہئے۔" اس ضمن میں پہلے ایک واقعہ عرض کرتا چلوں۔ جمال عبدالناصر صدر جمہوریہ متحدہ عربیہ کے پاکستان میں حالیہ دورے کے موقع پر ریڈیو پاکستان نے ریڈیو مصر سے بطور خاص رابطہ قائم کرنے کے اہتمامات کئے تاکہ اہل مصر کو بھی ان سرگرمیوں کا اندازہ ہو سکے جو صدر ناصر کے دورۂ پاکستان میں رونماں ہوئیں۔ چنانچہ ریڈیو پاکستان (کراچی) کے شعبۂ انجنیئری کے ایک افسر نے ریڈیو مصر کے اسٹوڈیو سے رابطہ قائم کرنا چاہا۔ یہ رابطہ انگریزی زبان میں قائم کیا جا رہا تھا۔ رو رابطہ قائم ہونے میں ذرا تاخیر ہوئی تو پاکستانی افسر نے جو عربی میں بھی تھوڑی بہت شُدبُد رکھتے ہیں عربی میں بولنا شروع کر دیا۔ اتفاق ہی سمجھئے کہ عربی زبان کے چند ہی کلمات اس پاکستانی افسر کی زبان سے ادا ہوئے ہوں گے کہ رابطہ قائم ہو گیا مگر ریڈیو مصر سے پہلا سوال کیا گیا تھا۔

کیا آپ عربی جانتے ہیں؟

جی ہاں! تھوڑی بہت۔ پاکستانی افسر نے جواب دیا۔

آپ کون کونسی زبانیں جانتے ہیں؟ مصری افسر کا دوسرا سوال تھا۔

انگریزی، فارسی، عربی، ہندی، اُردو!

اُردو، اُردو کیا؟ مصری افسر کے لہجہ سے تعجب کا اظہار ہوتا تھا۔

جی اُردو ۔ پاکستان کی زبان ہے۔ پاکستانی زبان "پاکستانی"

جب یہ واقعہ مجھے اس پاکستانی افسر نے سنایا تو واقعی میں خود حیران تھا، مگر آپ دیکھئے کہ اس پاکستانی افسر نے اُردو کے

متعلق کیا جواب دیا۔ "پاکستانی زبان" "پاکستانی" مختصر مگر گستدر معنی خیز!
بلاشبہ صدیوں کا ذہنی و نفسیاتی رشتہ ایک دم ٹوٹتے دیکھ کر افسوس ہوگا مگر اس کے بجائے کہ حکومت مارشل لاء آرڈر کے ذریعہ اس نفسیاتی تعلق کو توڑنے پر مجبور کرے کیا اس سے یہ بہتر نہیں ہے کہ ہم خود ہی اس حقیقت کا اعتراف کرکے اُردو دوستی اور وطن پرستی کا عملی ثبوت دیں۔

سید امیر امام۔ کلفٹن۔ کراچی

جناب مدیر!

"انشائیہ" خیالات اور زبان دونوں کے لحاظ سے وسیع و رفیع ہے۔ ہماری ادبی پسماندگی اور فکری جمود قابل افسوس ہے البتہ یہ حالات اس وقت خود بخود بدل جائیں گے جب ہمارا نظام اجتماعی و اقتصادی ایک نئی تند رفتار روش سے ہم آہنگ ہو جائیگا۔ اس وقت اس کے کہنے کی ضرورت ہی نہ ہوگی کہ ہمیں اپنی ادبیات اور اپنی ثقافت سے جمود و رجعت پسندی کا شکوہ ہے۔ البتہ اس اساسی تغیر کے بغیر آپ جس تحریک کی سعی کریں گے وہ اگر کامیاب ہو بھی گئی تو اردو کی تمام خدمات کے ساتھ کامیاب ہوگی اور اسی وقت پیدا ہوگی جب آپ کے اجتماعی و اقتصادی نظام کے اعماق سے نغمات کا ظہور ہو۔ ممکن ہے کہ دفعتاً آپ کی ثقافتی اور ادبی دنیا میں ایک روح تازہ دوڑ جائے اور پھر حرکت میں وہ سرعت پیدا ہو جائے جسے آپ اگر روکنا بھی چاہیں تو نہ رک سکے۔

"اُردو یا پاکستانی" ایک قابل غور مسئلہ پر روشنی ڈالتا ہے۔ البتہ بعض باتیں میری سمجھ میں نہ آئیں۔ اُردو اگر پاکستان کی زبان کا نام ہے تو اس میں کیا مضائقہ ہے۔ یہ ضروری تو نہیں کہ زبان کا اور ملک کا نام ایک ہو۔ مثلاً کناڈا، ولایات متحدہ۔ ارجنٹائنا۔ برازیل۔ مصر۔ عراق۔ سوریا۔ سوڈان۔ لیبیا۔ مراکش۔ تونس۔ الجزائر آسٹریا۔ آسٹریلیا۔ نیوزی لینڈ۔ سوئٹزرلینڈ۔ کی زبانوں کے نام ان ممالک کے نام سے مختلف ہیں۔ یعنی انگلش۔ اسپینش۔ عربی۔ جرمن یا بقول خود اہل زبان کے ڈوئش، فرانسہ۔ ایطالیانو۔ یہ زبانیں مذکورہ بالا ممالک کے ناموں سے صوتی یا معنوی کون سا تعلق رکھتی ہیں؟ خود فارسی زبان اہل ایران اور اہل افغانستان کی زبان ہے، پس اگر اُردو کو اردو ہی کہا جائے تو کیا مضائقہ ہے؟ اس مسئلہ میں کیا دشواری ہے اور آیا یہ کوئی مسئلہ ہے بھی یا نہیں۔ یہ بات میرے فہم سے بالا ہے۔

جہاں تک اُردو کے ابتدائی اسماء میں یہ قابل تحقیق مسئلہ ہے کہ اسم سابق کون ہے اور آخر کون ہے۔ البتہ اُردو کو گو کہ بعض احباب غلط فہمی کے سبب سے کبھی ہندی کہتے تھے اور کبھی ہندوستانی تو یہ بات لائق توجہ نہیں ہے۔ اُردو کا ایک نام ریختہ بھی رہ چکا ہے۔

اب رہا یہ کہ نام کی تبدیلی میں کوئی مصلحت مدنظر ہے جو خود اُردو کی بقا اور قومی فلاح کے لئے ضروری ہے تو وہ دوسری چیز ہے جس پر مجھ سے کم علم کو فیصلہ صادر کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ البتہ یہ ضرور سمجھ میں آتا ہے کہ زبانیں بنائی نہیں جاتی ہیں بلکہ تاریخی و اقتصادی تغیرات کے ضمن میں اس طور پر وجود میں آتی ہیں کہ انہیں افراد کو بحیثیت افراد مداخلت کا بہت ہی کم موقع ملتا ہے اور وہ عوامل جو تاریخی اور اجتماعی تغیر میں دخیل ہوتے ہیں اس قدر پیچیدہ اور دقیق ہوتے ہیں کہ ان کا احصاء بطور کلی محال ہے۔ انہی عوامل کے نتائج میں زبان بھی تحت باقی رہا جاتی ہے نئی نئی شکلیں اختیار کرتی ہے یا بالکل بدل جاتی ہے۔ خدا جانے ہماری اُردو کا کیا مستقبل ہے! ۔۔ جوش صاحب کی نظم "نزع کے ہنگام" جیسا عنوان ہو ایسی ہی داستان ہو اس

ذہن سے یہ اشعار کسطرح نکلے جس نے ثنویت کو برسوں اپنی گرم روی اور تندگامی سے پائمال کیا؟ یہ بھی ایک کہانی ہے جس میں ہماری ادبی و ثقافتی کوتاہ بینی و تنگ نگاہی کی داستان شاید ملجائے

سلطان جیلانی - نیوزن روڈ - لندن - ایس - ڈبلیو - ۵

محترمی جون ایلیا صاحب!

مارچ کے شمارے میں "عشق کیوں ہوتا ہے" بڑھا فاضل مصنف نے مولانا روم اور یونانی افسانوی پسندوں کا اپنے محبت سے متعلق سائنٹفک مضمون میں (بادی النظر میں مصنف کا زاویہ سائنٹفک ہی معلوم ہوتا ہے) جس دلچسپ انداز میں ذکر کیا ہے، قابل داد ہے۔ غیر ORIGINAL حضرات جب اس مضمون پر سائنسی انداز میں سوچتے ہیں تو بہک جاتے ہیں۔ اور شخصیت کے ذہنی اور جذباتی ارتقاء غدودوں کے عمل کلچر اور دیگر ثقافتی قوتوں کا ذکر لے بیٹھتے ہیں اور مضمون بالکل غیر دلچسپ (یا سائنٹفک؟) ہو جاتا ہے۔

اگر محترم تقی صاحب کے انداز میں دیگر حضرات بھی سائنسی مضامین لکھیں تو کتنا دلچسپ اور مجھ جیسے افراد کے لئے علمی طور پر کتنا سودمند ہو۔ مجھے انشاء دیر سے ملتا ہے لہٰذا مارچ کے انشاء سے متعلق میرا یہ دیر رس ردعمل امید ہے معاف فرمائینگے

انور خواجہ - پشاور

مکرمی جون ایلیا صاحب!

"انشاء" کا معیار اب بہت اچھا ہو گیا ہے۔ کراچی میں مدت سے ایک ایسے پرچے کی ضرورت تھی جو ادبی اجارہ داری اور ایڈیٹر کی ادبی جاگیرداروں کے مقابلے میں کوئی صحت مند روایت قائم کر سکے نئے لکھنے والوں کو بڑی دقتیں اور اذیتیں اٹھانی پڑتی رہیں — لاہور کے "نقوش" وغیرہ نے کچھ ایسی فضا خراب کی ہے کہ نئے لکھنے والوں کو اچھوت سمجھا جانے لگا ہے اور ہمارے کچھ بھائیوں نے پنجابی اردو، لکھنوی اردو اور دہلوی اردو کا جھگڑا ابھی تازہ کر دیا ہے۔ اس صورت میں ہم کشمیری اور سرحد کے لوگ تو بے زبان ہوئے اور ہمارے ادب کو کون قابل اعتبار سمجھے گا۔ یہ رجحان بڑا منفی اور غیر افادیت پسند ہے۔ اس بات کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ یہ تنگ نظری اور تعصب آپ سے کوسوں دور ہے اور آپ نئی نسل کے ادیبوں کی حتی المقدور حوصلہ افزائی اور راہنمائی کرتے رہتے ہیں۔

میں ان ادبی ٹھیکیداروں کے مقابلے میں وقتاً فوقتاً احتجاج کرتا رہتا ہوں۔ اب "نقوش" نے تازہ حرکت یہ کی ہے، کہ اپنے دس سالہ انتخاب نمبر کو "ادب عالیہ" نمبر کر کے شائع کر دیا۔ حالانکہ اس بیچارے کو یہ علم بھی نہیں ہے کہ ادب عالیہ آخر کس چڑیا کا نام ہے اور دس سال کی قلیل مدت میں ادب عالیہ تخلیق نہیں ہو سکتا ہے اور اگر ایسے معجزے ہو بھی جائیں تو ضروری نہیں کہ وہ سارا "ادب عالیہ" "نقوش" کو ہی ودیعت کر دیا جائے۔ اور جس شخص نے یہ "ادب عالیہ" پیش کیا اور مرتب کیا اس کا کوئی ٹھوس ادبی پس منظر بھی نہیں۔ یوں تو ہر رسالے کا ایڈیٹر آسانی سے ادب کے "باوا لوگوں" کی فہرست میں جگہ حاصل کر سکتا ہے۔ یہ نمبر شائع کر کے نقوش نے ایک طرف عوام کو دھوکہ دے کر ان کی جیبوں پر ہاتھ صاف کیا ہے اور دوسری طرف ادیبوں کو "ادب عالیہ" کے نام سے خوش کر کے ان کو معاوضہ سے محروم رکھا ہے

———— آپ کے "ٹھگ" نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ بڑا منفی خیز قصہ ہے۔ اور بڑا دلچسپ ہے۔

امین اشرف - ایڈیٹر علی گڑھ میگزین - علی گڑھ

مدیر محترم — سلام مسنون! اپریل کا "انشاء" نظر نواز ہوا، سرورق اور انشائیہ — یہ دو چیزیں قابل قدر ہیں، سرورق دیدہ زیب اور انشائیہ فکر انگیز، شعری حصہ مضامین پر بھاری ہے بالخصوص شمیم الدرد ہوی کی تخلیق تازہ شمارہ کی جان ہے

صرف سرورق سٹی پرنٹرز کیمھم جی رام داس اسٹریٹ کھارادر - کراچی میں چھپا